Title - LONDON KI ĒK RAAT ।।

Creator - Sajjad Zaheer ।

Publisher - Musannif (Delhi).

Date — 1960

Pages - 122

Subjects - Urdu Novel ।

لندن کی ایک رات

سجاد ظہیر

سول ایجنٹ

ادکتاب گھر۔ کلاں محل۔ دلی

پہلی

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

جون ۱۹۶۰
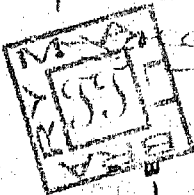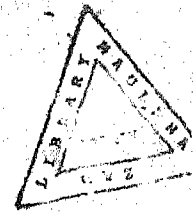
قیمت دو روپے پچیس نئے پیسے

اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔ یورپ میں ہندوستانی طالبعلموں کی زندگی کا ایک رُخ اگر دیکھنا ہو تو اسے پڑھیئے۔

اس کا بیشتر حصّہ لندن، پیرس، اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اب میں اس مسوّدہ کو پڑھتا ہوں تو اسے چھپاتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے۔ یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد اور تعلیم ختم کرنے کے بعد، چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر اک مخصوص جذباتی کشمکش سے متاثر ہو کر سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور اُن کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔

میں اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں

سجّاد ظہیر

وزیر منزل۔ لکھنؤ

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء

[illegible]

1.9.78

سراج الحق ۱

لندن نہایت گھنے، زردی مائل، گاڑھے، تاریک کہرے سے ڈھکا ہوا ہے۔ ایک ایسا لحاف جو نم ہو اور ٹھنڈا جس سے ہمارا سارا جسم اور خصوصاً ناک اور منہ ڈھانپ دیا جائے۔ سانس مشکل سے لی جائے۔ سانس لیتے وقت یہ معلوم ہو کہ تر دھواں پی رہے ہیں۔ ہر چیز پہ مہین مہین پانی کے قطرے جمے ہوئے ہیں سردی زیادہ نہیں۔ لیکن جتنی بھی ہے تکلیف دہ ہے۔ تیسرا پہر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رات ہو گئی۔ سڑک کی روشنی میں چمک نہیں، اندھیرے اور روشنی میں معلوم ہوتا ہے لڑائی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی کہرے کے ہلکے ہو جانے سے گیس کی روشنی چمک اٹھتی ہے۔

اس کیفیت کے باوجود لندن کی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں دوکانیں روشن اور سڑکیں موٹروں، لاریوں اور بسوں سے بھری ہوئی ہیں، کنارے کی پٹری پہ جہاں لوگ پیدل چلتے ہیں۔ دفتروں سے نکلے ہوئے لوگ، منشی، محرر، کاروباری، ٹائپ کرنے والی لڑکیاں، طالب علم، اور چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں تیز تیز قدم بڑھائے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ چھ بج چکے ہیں اور "لیمپسن"

میں جہاں لندن کے طالب علم، "اہلِ دماغ" "اصلی اور نقلی" ہر قوم کے لوگ جو انگلستان کی سیر کو آتے ہیں آکر ٹھہرتے ہیں۔ جہاں انگلستان کے ذہنی انقلابی آرٹسٹ، غریب، مصنف، وہ سب لوگ جو ایک روحانی خلا میں معلق ہیں مل جل کر عجیب و غریب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

چھ بج کر دس منٹ ہو گئے۔ رسل اسکوائر کے "انڈر گراؤنڈ اسٹیشن" کی گھڑی پر بار بار اعظم کی نظر جاتی ہے

"کمبخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے نہیں آئے گی۔ یہ پہلی بار نہیں ہے مجھے اپنی حالت پر خود شرم آتی ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ذرہ برابر بھی میرا خیال نہیں کرتی مگر میں ہوں کہ اس کا پیچھا ہی چھوڑتا۔ آخر لندن میں اور بہت سی لڑکیاں ہیں اور میں کچھ ایسا بدصورت بھی نہیں۔ مگر میں اسی قدر کمزور ہوں۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی قابو نہیں۔ کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں۔ اُس سے بات تک نہ کروں۔ سڑک پر ملے تو دوسری طرف منہ پھیروں اور اگر وہ میرے پاس اپنی مرضی سے آئے تو صاف صاف کہدوں "چلی جا میرے پاس سے اگر مجھ سے تجھے محبّت نہیں تو کیوں میرے پاس آتی ہے کوئی اور عاشق ڈھونڈ تیرے اور بہت سے طلبگار ہیں۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔" اور اسی طرح کے اور بہت سے تیز و تند کلمے جس سے دراصل اُس کے دل پر چوٹ لگے اُسے تکلیف پہونچے اُسے اذیت ہو۔ اس طرح سے میں اس سے بدلہ لوں۔ مجھے جو پریشانی اکوفت اُلجھن، بے اطمینانی، حسد، رشک، غصہ، رنج اس کی وجہ سے ہوتا ہے اس کا بدلہ لوں۔ لیکن کبھی مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلے ایک بار اس نے سنیچر کی شام کو ملنے کا وعدہ کیا۔ کہا کہ ساڑھے سات بجے آئے گی۔ چھ بجے تک اسے دفتر میں کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد گھر جائے گی اور پھر ساڑھے سات بجے تک میرے یہاں پہنچ جائیگی

ساڑھے سات سے آٹھ بجے، آٹھ سے نو اور نو سے دس، میں کھانا کھانے بھی نہیں جا سکا۔ انتظار، انتظار، دس بجے کمرے کے دروازہ پر کھٹ کھٹ۔ غصّہ کے مارے میں نے جواب تک نہیں دیا کہ "ہاں چلے آؤ" دروازہ کھلا۔ کون؟ وہ نہیں بلکہ خادمہ "مسٹر اعظم آپ سے کوئی ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتا ہے" معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم کا سارا خون ایک لمحہ کے لیے دوڑ کر میرے سر میں پہنچ گیا۔ گرم گرم خون۔ میں نے جواب دیا "تھینک یو میری!" اور یہ کہہ کر ٹیلیفون سننے گیا۔

"کون ہے؟" میں نے کہا اگرچہ مجھے معلوم تھا۔

"میں ہوں ڈارلنگ۔ میرے پیارے۔ تم مجھ سے بہت بہت خفا ہو؟ تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے۔ مجھے معاف کرو۔ مگر قصور میرا نہیں، کچھ لوگ ہمارے یہاں ملنے کے لئے آ گئے۔ میری والدہ نے کہا کہ میں ان کی مہمان داری کروں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کچھ بہانہ کروں، مگر کچھ بنائے نہ بنی اور اب بہت دیر ہو گئی۔ پیارے اعظم معاف کر دو۔"

میرے غصّہ کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں ایک ہفتہ سے اس سے ملا نہیں تھا۔ ہر روز کچھ نہ کچھ کام اسے لگا رہتا تھا اور آج آخر کار وہ مجھ سے ملنے آنے کو تھی اور اس طرح سے اس نے میری آرزوؤں اور تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔ میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ "جہنم میں جاؤ!" کہہ کر ٹیلیفون رسیور کو اس کے خانہ میں رکھ دوں۔ اور اس گفتگو کا خاتمہ کر دوں۔ یہ گفتگو جو "تاروں" پر ہو رہی تھی یہ گفتگو جس میں انسانی آواز — انسانی پیکر سے جدا ہو کر محض آواز بن کر خالص آواز ہو کر ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے اور تھوڑی بہت الہام کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ الہام تو آسمانی "حقیقت" ہے لیکن ٹیلیفون کی آواز میں سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنا بہت دشوار ہے جھوٹ بولنے کا بہترین طریقہ۔ یقیناً وہ جھوٹ

بول رہی تھی۔ مہمان آگئے! وہ کچھ بہانہ تو کر ہی سکتی تھی اور اس کی ماں اسے باہر جانے کی اجازت دے دیتی۔ ضرور اجازت دے دیتی۔ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ بہانہ کر رہی ہے۔ دراصل وہ کسی اور کے ساتھ گئی ہوگی۔ عین وقت پر کوئی اور پسند آگیا ہوگا اس کے ساتھ سیر و تفریح، سینما، تھیٹر، یا موٹر پر گھومنے میرے پاس تو موٹر بھی نہیں اور میں کوئی امیر کبیر نہیں۔ اصلی وجہ نہ آنے کی یہ ہے اور اب بہانہ کر رہی ہے۔" ڈارلنگ اعظم! پیارے اعظم!" جھوٹی دغاباز یہ سب کچھ تھا لیکن میں نے جواب دیا:۔

"دراصل! اور میں تمہارا انتظار کرتے کرتے ادھ مرا ہو گیا۔ تم نے کم از کم ٹیلیفون تو اور پہلے کر دیا ہوتا۔ لیکن ابھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔" انڈر گراونڈ" اور "بسیں" تو ساڑھے بارہ بجے تک چلتی رہتی ہیں۔ میرے ساتھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تم گذار سکتی ہو ......"

میری آواز میں بجائے غصہ کے گڑگڑاہٹ آگئی مجھے اس کا احساس ہو رہا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے کو ذلیل کر رہا ہوں۔ لیکن ایک ایسی طاقت جس کے سامنے میں بالکل لاچار و مجبور تھا، معلوم ہوتا تھا مجھے پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ میں نے اپنی خودداری کو اپنی نظروں میں قایم رکھنے کے لئے سوچنا شروع کیا کہ عشق میں ذلت اٹھانا دراصل ذلت نہیں۔ اردو کے ان تمام شاعروں کے شکوے اور گلے مجھے یاد آنے لگے جو کوچۂ جاناں کے کتے بن کر اغیار کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، دربان کی گالیاں سنتے ہیں اور معشوق کے ہرجائی پن اور ناز اور نخرے کو لذت روح سمجھ کر نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ خود اس کی خواہش کرتے ہیں کہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔

لیکن ہماری شاعری اور چیز ہے۔ اور ذلت کی حقیقت کچھ اور۔ میں

اپنے دِل کو لاکھ سمجھاؤں لیکن حقارت کی شرمناک صورت بار بار میری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

اس نے جواب دیا "نہیں ڈارلنگ اعظم۔ اب بہت دیر ہو گئی۔ صبح سات بجے مجھے اٹھنا پڑتا ہے۔ تم تو جانتے ہو ...."

"مگر کل تو اتوار ہے۔ تمہیں دفتر تو جانا نہیں"۔

"ہاں یہ تو ہے مگر پھر بھی تم جانتے ہی ہو۔ اتوار کے دن گھر میں خادمہ دیر سے آتی ہے اور مجھے گھر کے کام میں والدہ کی مدد کرنی ہوتی ہے۔ دراصل میں سچ بول رہی ہوں .... تم معلوم ہوتا ہے میری باتوں کا یقین نہیں کر رہے ہو... یہ بہانہ نہیں۔ تم جانتے ہو میں تم کو کس قدر چاہتی ہوں۔ اچھا کل میں بارہ بجے کے قریب تم کو ٹیلیفون کروں گی اور پھر اس وقت کسی دوسرے دن تم سے ملاقات کا وقت طے کروں گی۔ اب مجھے اس وقت معاف کرو"۔

مجھ سے ٹیلیفون پر بات کرنے تک کی اسے اس وقت فرصت نہیں۔ اور کل صبح سویرے اٹھنا ہے اپنی مدد کرنے کے لئے۔ جھوٹ جھوٹ۔ وہ ضرور کسی اور کے ساتھ سیر و تفریح کو جا رہی ہے۔ میں نے اپنے دِل میں کہا کہ بس اس سے اچھا موقع اب نہیں مجھے ملے گا۔ اس سے صاف صاف کہہ دوں جو کچھ بھی میرا شبہ ہے مگر میں نے جواب دیا:۔

"اچھی بات ہے، جین، کل بارہ بجے تمہارے ٹیلیفون کا میں انتظار کروں گا۔ گڈ نائٹ"۔

اور دوسرے دن ٹیلیفون ندارد۔ سارا دن میرا بیکار ضائع ہوا۔ اگر راؤ ایک بجے کے قریب ملنے نہ آجاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ راؤ خوش قسمت آدمی ہے اسے کبھی عشق عاشقی کے جنجال میں پڑتے کسی نے نہ دیکھا۔ باوجود اس کے ہمیشہ کوئی

نہ کوئی بانکی لڑکی اس کے قبضہ میں رہتی ہے۔

کب تک یہاں میں انتظار کروں۔ سوا چھ بج گئے۔ سردی ہے اور جین کا ابھی تک پتہ ہی نہیں۔"

لیکن جین کا ہنستا ہوا چہرہ، اس کا لمبا چھریرا بدن، اس کی چمکدار آنکھیں جو ہر وقت گھبرائی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھتی ہیں۔ اس کی ہنسی کی آواز اُس کا گھبرا کر جھوٹ بولنا یہ سب اعظم کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندتا اور اس کے دماغ کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے بالکل بے حس کر دیتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے منٹ انڈر گراونڈ کی لفٹ کا دروازہ کھلتا اور لوگ اس میں سے باہر نکلتے، کبھی بیس، کبھی تیس، کبھی اس سے زیادہ کبھی اس سے کم اور اعظم کی نظر اس سارے گروہ پر پڑتی۔ اور جب آخری شخص نکل جاتا اور جین کی صورت اسے نظر نہ آتی تو پھر اس کی پریشانی بڑھتی، کبھی گھڑی پر نظر کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ اخبار کی دوکان کے سامنے بڑے بڑے اشتہار لگے ہوئے تھے "ٹائمز، ڈیلی میل، مارننگ پوسٹ، ڈیلی ٹیلیگراف وغیرہ اس کی نظر شام اخباروں پر پڑی، جنھیں لوگ اسٹیشن کے باہر بیچ رہے تھے۔

"فٹ بال کے میچ کے نتیجے" "میچ کے آخری نتیجے" اخبار بیچنے والے پکار رہے تھے۔ اتنے میں اس کی نظر چند اور اشتہاروں پر پڑی جو تختوں پر چپکے ہوئے تھے "بیکار مزدوروں کا ہائڈ پارک میں جلسہ" "دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار ہندوستانی نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا" "ایک گورا زخمی ہوا۔ اور ۱۵ نیٹوز کی جان گئی" بڑے بڑے، کوئی ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہار سرخ حرفوں میں لکھے ہوئے تھے، اعظم کا خیال ایک لمحہ کے لئے اپنے دوست کے انتظار سے ہٹ کر ہندستان، وطن کی طرف گیا "یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ "نیٹوز"

ہم "نیٹوز" ہیں۔ اور یہ لال مُنہے بندر، جو اس ملک میں رہتے ہیں یہ کون ہیں؟
اور وہ بیچارے غریب جنھوں نے گوروں کی گولیاں کھائیں؟ اور ہائیڈ پارک کے بیکار انگریز مزدور جو بھوکے مرتے ہیں؟ اعظم کا خیال اس طرف نہیں گیا

عربی کی ایک مثل ہے کہ "انتظار موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے"۔ موت جب بہت قریب ہوتی ہے تو مرنے والے کے ہوش و حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ انتظار کی شدّت ذہن کو کام کرنے سے روک دیتی ہے، خصوصاً ایسا انتظار جیسا اعظم کو تھا۔ اب تو وہ جین کے آنے کو بھی بھول سا گیا۔ جین کا آنا، اس کی اور اعظم کی ملاقات، خوشی، یا اس کا نہ آنا اور کلفت۔ ان تمام خیالات اور احساسات نے مادّی حقیقت کے جامہ کو چھوڑ کر دھندلی سی غیر معنوی صورت اختیار کر لی اور اس کے ذہن پر ایک کالی گھٹا سی چھا گئی۔

"ہلّو اعظم! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟" انڈر گراؤنڈ اسٹیشن سے راؤ نکلا اور اس نے اعظم کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

راؤ کے اس طرح سے یکبارگی آجانے سے اعظم کے دل کو فوراً سکون ہو گیا جس طرح رنج اور اذیت کے وقت رونے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے اسی طرح اس وقت اعظم کا خیال جو صرف ایک نقطہ پر جم کر اس کے دل میں ناسور کی طرح سے چبھنے لگا تھا اب دوسری طرف ہٹ گیا۔ راؤ اس کا دوست تھا۔ لیکن اعظم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ راؤ کو جواب کیا دے۔ یہ کوئی بڑے فخر کی بات تو تھی نہیں کہ جین کے انتظار میں کھڑے ہوئے رسل اسکوائر کے اسٹیشن پر میاں اعظم سردی کھا رہے ہیں اور اُن جانِ جہاں کا پتہ ندارد۔ لیکن "اعظم نے اپنے دل میں سوچا "راؤ سے چھُپانے سے آخر کیا فائدہ؟ وہ ضرور بھانپ جائے گا" اور اس نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جین سے اپائنٹ منٹ

تھا۔ چھ بجے اس نے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی تک وہ آئی نہیں۔ چھ بج کر بیس منٹ گئے۔ نعیم کے یہاں آج پارٹی ہے۔ اس نے دونوں کو بلایا تھا میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

راؤ کا خیال اعظم کی اندرونی حالت کی طرف نہیں گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے کہ وعدہ کے بموجب کوئی ملاقات کے لئے نہ آئے! خصوصاً ایک لڑکی۔ سنگار کرنے میں بیچاری کو دیر ہو گئی ہو۔ اسے اپنے لبوں کی لالی کی گہرائی شاید نہ پسند آئی ہو اور وہ اسے دوبارہ ٹھیک کرتی ہو۔ یا شاید اسے اپنی ٹوپی کی کجی درست کرنے میں دیر لگ گئی ہو۔ غرض دیر ہو جانے کے سیکڑوں سبب ہو سکتے ہیں۔ غصہ اور بے چینی کا تو کوئی موقع نہ تھا۔

لیکن راؤ جین کا عاشق تو تھا نہیں، اعظم کو تو اس سے عشق تھا۔

راؤ نے کہا "کیا! تم بھی نعیم کے یہاں مدعو ہو؟ مجھے بھی اس نے بلایا ہے چلو پھر ساتھ چلیں۔ جین کو نعیم کا پتہ تو معلوم ہی ہے۔ وہ وہاں سیدھی چلی آئیگی۔ یہاں سردی میں ٹھٹھرنے سے کیا فائدہ آؤ چلو۔"

اعظم ایک لمحہ کے لئے ہچکچایا کہ رُکے یا نہ رُکے۔ شاید وہ پانچ منٹ کے اندر آجائے۔ اگر اب چلا جاؤں تو اتنی دیر تک رُکنا بیکار رہا۔ اور شاید وہ نہ آئے کیا معلوم؟ راؤ سمجھ گیا کہ اعظم کس کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنے مدراسی لہجے میں تیزی سے پھر کہا "چلو بھی اعظم یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ کچھ یہ تو ہے نہیں کہ جین نے اگر تم کو یہاں نہ پایا تو وہ واپس چلی جائے گی۔ اگر اسے آنا ہے تو سیدھی نعیم کے یہاں آسکتی ہے۔"

اعظم نے طے کر لیا کہ راؤ کے ساتھ چلا جانا بہتر ہے۔ اسے پھر اس خیال نے گھیر لیا کہ وہ اس عورت کے پیچھے اپنی خودداری تک کھو بیٹھا ہے۔ ذلت کے

بھاری بوجھ سے اس کا دل بھر بیٹھنے لگا۔ اس کے قدم اٹھے لیکن آہستہ آہستہ اور وہ راؤ کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکلا۔ راؤ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی مجروح جانور۔ اذیت اور بے بسی، وحشت اور لاچاری۔ راؤ نے یکبارگی محسوس کیا کہ اس کے دوست کی کیا حالت ہے اسے یہ خیال کر کے شرمندگی سی ہوئی کہ اس نے اعظم کی اصلی کیفیت کا ابھی تک اندازہ نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات بھر آئے۔ پھر کچھ ترس آیا، کچھ ہنسی آئی۔ اس لڑکی نے اچھے خاصے، بھلے چنگے انسان کو پاگل کر دیا۔ آدھے گھنٹے سے کھڑا یہاں غریب انتظار کر رہا ہے۔ اور وہ ہے کہ آنے کا نام تک نہیں لیتی۔ یہ آج پہلی دفعہ نہیں اب تو اعظم کی پڑھائی پر بھی اس کا اثر پڑنے لگا ہے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو امتحان میں پاس ہونا مشکل ہو جائے گا۔ کسی طرح سے اس سے اعظم کا پیچھا چھوٹے تو اچھا ہو۔

راؤ نے کہا " ارے بس بھائی اعظم اتنے غمگین مت ہو۔ جین ضرور تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہو گی۔ آج کہرا کس قدر ہے اور سردی بھی۔ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ چلو "پب" میں چلتے ہو۔ ایک ایک گلاس بیئر پیئیں۔ پھر نعیم کے یہاں چلیں گے۔"

اعظم کی قوتِ ارادی اب بالکل غائب ہو گئی تھی۔ " ہاں ضرور" اس نے آہستہ سے کہا۔ " سردی میں ایک ایک پگ وہسکی یا برانڈی کیوں نہ پی جائے" راؤ اور اعظم دونوں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے، کہرا چند منٹ کے لئے کم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بجلی کی روشنیاں چمک اٹھی تھیں۔ راؤ کا سیاہ چہرہ، بڑی بڑی بیضاوی آنکھیں، جیسے پرانے راجپوت شہزادوں کی تصویروں میں ہوتی ہیں اس کا میانہ قد اور نازک سا جسم، ہندو دیوتاؤں کی طرح کا، کالے ریشم کی طرح

ملایم بال جو اس کی پیشانی پر گرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی، لیکن کچھ کیریکٹر کی کمزوری بھی معلوم ہوتی تھی، بجلی کی روشنی کے سامنے جب اس کا چہرہ آتا تھا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ اعظم کی حالت پر افسوس کر رہا ہے۔

اعظم کی نظر راؤ کے چہرہ پر پڑی، اُسے فوراً اس بات کا احساس ہوا کہ راؤ اس سے اظہار ہمدردی کر رہا ہے۔ لفظوں میں نہیں بلکہ اپنے رویہ سے اور اپنی خاموشی سے۔ اعظم کو تھوڑا بہت سکون ہو گیا۔ دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں علاوہ عشق کے۔

"تم نے آج شام کا اخبار دیکھا؟ ہندوستان میں پھر کہیں گولی چلی ہے" اعظم نے کہا۔ "نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ روز کا دستور ہوتا جاتا ہے۔ ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑوں مکوڑوں کے برابر ہے۔ اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا! ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں، کمینے، ذلیل بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔ ہندو مسلمان کی جان کے درپے، مسلمان ہندو کا گلا گھوٹنے کے لئے تیار۔ گولی نہیں میرا تو بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے منہ پر رکھ کر اڑا دوں۔ اس قوم کو زندہ ہی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ خیال تو کرو ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں۔ مگر سوئز کے اس پار تو ہم سب "کالا لوگ" "ٹیٹوز" غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں اور تم انجنیر مگر ہندوستان میں وہی

"نیٹو" کے "نیٹو" ہو گئے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے اور باوجود اس کے پھر اُلٹ کر انھیں کو "سرکار سلام" "خداوند" اور "مائی باپ" کہو گے۔ اتنی ذلّت برداشت کرنے پہ بھی جس قوم کے کان پر جوں نہ رینگے اس کا تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جانا ہی بہتر ہے مجھے تو خوشی ہوتی ہے جب ہندستان سے گولی چلنے کی خبر آتی ہے"۔ راؤ نے تلخی کے ساتھ کہا۔

اعظم راؤ کی اس مبالغہ آمیز گفتگو پہ ہنس پڑا۔ اسے پالیٹکس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی مگر راؤ کی اِن باتوں میں اس قدر حرارت تھی کہ اعظم تک اس کا اثر پہونچ ہی گیا۔

"بھئی راؤ، اتنا بھی کیا مبالغہ! اس طرح باتیں کرنا تو سہل ہے مگر جو لوگ وطن کی ترقی کی کوشش کر رہے ہیں ان کی مدد کرنے کے لئے کوئی نہیں تیار ہوتا اگر ایسا ہی تم چاہتے ہو کہ ہندستانی ذلّت سے نجات پائیں تو پھر تم جا کر ان لوگوں کی مدد کیوں نہیں کرتے جو وطن کی بھلائی کے لئے کوشاں ہیں؟"

"وطن کی بھلائی کے لئے کوشاں ہیں؟ ذرا مجھے بتایئے تو سہی" راؤ نے تیزی سے پوچھا "کسی کو یہ تک تو معلوم نہیں کہ وطن کی بھلائی ہے کس چڑیا کا نام" اس کے لئے کوشاں ہونا تو درکنار! زنانہ بن کر چرخہ کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا مہاتما گاندھی کی طرح سچ کی کھوج کرنے میں وطن کی بھلائی ہے یا کونسل کی ممبری اور منسٹری میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرنس میں حصّہ لینے میں وطن کی بھلائی ہے؟ سرکاری ملازمت میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ میں وطن کی بھلائی ہے؟ ہر شخص کے پاس وطن کی بھلائی کا ایک نسخہ ہے۔ ہر شخص معلوم ہوتا ہے وطن کی بھلائی کے لئے کوشاں ہے ہر شخص پکار پکار کر کہتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لئے کام کر رہا ہے۔ حد ہو گئی! ان کی دیکھا دیکھی

انگریزی گورنمنٹ تک کہنے لگی کہ وہ بھی ہندستان کی بھلائی ہے! اور ملک کی حالت کیا ہے ؟ ایک طرف تو غربت اور بھوک کا سایہ ملک پر پھیلتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ظلم وجبر کا جال چاروں طرف سے ہم کو جکڑ رہا ہے۔ کیا اچھے ہماری بھلائی کرنے والے ہیں۔ میں باز آیا ایسی بھلائی کرنے سے۔ کم از کم میں کسی کو دھوکا تو نہیں دیتا۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میں صرف اپنی بھلائی چاہتا ہوں۔ رہ گیا وطن اور اس کی خدمت، میاں اعظم ہندستان کی حالت حد سے گذر چکی ہے۔ جتنی جلدی یہ قوم جس کا نام ہندستانی ہے فنا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔" راؤ تم کو تو خودکشی کر لینا چاہیے۔ میں نے تم سے بڑھ کر کوئی یاس مشرب انسان نہیں دیکھا لیکن دیکھنے میں تم اتنے خوش نظر آتے ہو عجیب بات ہے۔" اعظم نے کہا" اور اس کا خیال پھر جین کی طرف گیا اور اپنی مایوسی کا احساس اسے ہوا۔ وہ یکبارگی چپ ہو گیا اور اس کے چہرے سے پھر غمگینی ظاہر ہونے لگی۔ راؤ نے فوراً اعظم کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور ہنس کر جواب دیا" خوشی سے زندگی بسر کرنے کا راز ناامیدی میں ہے۔ ناامیدی کا بلند ترین درجہ کامل بےحسی کی کیفیت ہے یہ وہ درجہ ہے کہ انسان کو خوشی اور غم آرام اور تکلیف میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔ ہم ہندو اسی کو نروان کہتے ہیں۔"

اعظم پر دوبارہ غمگینی پوری طرح سے چھا گئی۔ اس نے راؤ کی باتوں پر ہنسنے کی کوشش کی، مگر اس کی ہنسی بےمعنی سی مسکراہٹ بن کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ جین آخر کیوں نہیں آئی۔ کیا در اصل وہ مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتی؟ لیکن اس نے سوچا کہ اگر ایسا ہوتا تو جین اس سے ملنے کا وعدہ کیوں کرتی۔ اس سے اظہار عشق کیوں کرتی، کیا اس کے پیار محبت کے الفاظ سب جھوٹے تھے؟ شک اور رشک کا دیو پھر اعظم کے ذہن پر قابو پانے لگا، کیا معلوم!

اس نے سوچا، شاید اس کے کئی عاشق ہوں۔ یہاں آج کل یہ کوئی بڑی بات تو سمجھی نہیں جاتی۔ مجھ سے بھی ہفتہ میں ایک دفعہ آکر وہ مل لیتی ہے اور پھر میرے علاوہ شاید کوئی اور بھی ہو۔ یا شاید چونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اگر مجھ سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ مجھ سے عشق نہیں کرتی تو مجھے بہت تکلیف ہوگی اس خیال سے وہ مجھ سے جھوٹ موٹ دہی پہلے کے سے تعلقات قایم رکھنا چاہتی ہے اور رفتہ رفتہ مجھ سے ملنا چھوڑ دے گی۔ اس طرح سے دیر کرنا اور وعدہ کر کے ملنے نہ آنا اسی کا پیش خیمہ ہے
کہرا پھر گھر آیا اور چاروں طرف اندھیرا بڑھ گیا۔ راؤ نے اپنے کوٹ کے کالر کو اٹھا لیا۔ کندھے جھکا لئے اور جیب میں دونوں ہاتھ پوری طرح ڈال کر تیزی سے چلنا شروع کیا۔

"آؤ ذرا اور تیز چلیں مجھے سردی معلوم ہو رہی ہے۔" راؤ نے کہا۔

اعظم نے کچھ جواب نہیں دیا مگر اس نے قدم تیز بڑھانے شروع کئے۔ چند منٹ میں وہ "پب" تک پہونچ گئے اور وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

۲

انگلستان میں شراب خانے عام طور سے دو یا تین حصّوں میں تقسیم ہوتے ہیں
سامنے کا حصّہ جس میں مزدور طبقہ کے لوگ جاتے ہیں اور اندر کا حصّہ جس میں پیسہ
والے لوگ جاتے ہیں کبھی کبھی ایک چھوٹا سا تیسرا حصّہ بھی ہوتا ہے۔ جہاں وہ
لوگ جنھیں جلدی سے واپس چلا جانا ہوتا ہے، شراب پی لیتے ہیں۔ اس حصّہ میں بیٹھنے
کے لئے کرسیاں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ شراب بیچنے والا درمیان میں ہوتا ہے۔ اس کی
چاروں طرف کوئی ڈیڑھ گز اونچی اور تقریباً ایک فٹ چوڑی لکڑی کی میز کی قسم کی
چیز ہوتی ہے اس میز میں اندر کی طرف نل لگے ہوتے ہیں۔ جن میں سے گلاس بھر
بھر کر بیئر ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو بوتل میں بھری ہوئی شرابیں نہیں پینا چاہتے
یہ ایک معمولی شراب خانہ تھا۔ غریبوں کے حصّے میں تین چار بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔
اور ان کے سامنے لکڑی کی میزیں تھیں۔ کچھ مزدور اپنے سامنے ایک گلاس بیئر
لئے ہوئے بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار بنچ والی میز کے کنارے ہوئے تھے
کسی کے سامنے شراب بیچنے والے نے ابھی ابھی گلاس بھر کر رکھا تھا جس سے
جھاگ اُٹھ رہا تھا کسی کا گلاس آدھا خالی تھا اور وہ خاموشی کے ساتھ اپنا پائپ
پی رہا تھا، اور کسی کا گلاس بالکل خالی تھا اور وہ ایک اور مانگ رہا تھا جتنا

کا دھواں سارے کمرے میں بھرا ہوا تھا۔

راؤ ندا اعظم اسی کمرے میں داخل ہوئے اور "بار" کے کنارے آکر کھڑے ہو گئے۔

"گڈ ایوننگ سر" شراب بیچنے والے نے راؤ کو دیکھ کر کہا۔ راؤ چونکہ اکثر اس شرابخانہ میں جایا کرتا تھا اس وجہ سے مالک دوکان اسے پہچاننے لگا تھا۔

"کتنا خراب موسم ہے" مالک نے سلام کرنے کے بعد فوراً کہا۔ انگلستان میں موسم پر اظہار رائے کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بجائے مزاج پرسی کے موسم کی اچھائی یا برائی کا ذکر کرنا ایک دستور سا ہو گیا ہے جس کے جواب میں دوسرا شخص اتفاق رائے کا اظہار کرتا ہے اور اگر اسے کچھ اور ضروری بات کرنا نہیں ہوتی اور اس کا دل چپ رہنے کو بھی نہیں چاہتا تو پھر موسم پر گفتگو چھڑ جاتی ہے ہر شخص اپنے اپنے تجربات بیان کرتا ہے، پار سال موسم اتنا برا نہیں تھا۔ پانچ سال ہوئے جب گرمیوں کے مہینے میں سورج بالکل دکھائی نہیں دیا اور مسلسل بارش ہوتی رہی اور جاڑوں بھر دھوپ ہی دھوپ رہی تیس برس پہلے اتنی سردی پڑی کہ نل کا پانی جم گیا۔ دریائے ٹیمس پر اسکیٹنگ ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس گفتگو کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ انگریز قوم نے غالباً انفرادی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے اس رسم کو رائج کیا ہے۔ موسم کی باتیں کر کے ہر شخص اپنے ذاتی معاملات پر اوروں کو گفتگو کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جس پر ہر شخص آزادی کے ساتھ اظہار رائے کر سکتا ہے۔ بغیر یہ بتائے ہوئے کہ اس کا "اسم شریف" کیا ہے۔ اس کا "دولت خانہ" کہاں ہے۔ اس کا پیشہ کیا ہے، اس کی تنخواہ کیا ہے۔ اس کا مذہب کیا ہے، اس کی ذات کون سی ہے جو ہمارے وطن کا دستور ہے۔

"گڈ ایوننگ" راؤ نے جواب دیا۔ ہاں کس قدر برا موسم ہے معلوم نہیں

یہ کہرا کب اٹھے گا" اور پھر اس نے اعظم سے پوچھا "کیا پیوگے ؟"

"برانڈی" اعظم نے جواب دیا۔ اسے اس وقت تیز شراب کی خواہش تھی۔

راؤ نے اعظم کے لئے برانڈی اور اپنے لئے وہسکی کا آرڈر دیا۔ شراب بیچنے والے نے دونوں گلاس اور سوڈے کی بوتل اعظم اور راؤ کے سامنے رکھدیئے راؤ نے سوڈا ملا کر اور اعظم نے بغیر سوڈا ملائے ہوئے، گلاس ساتھ ساتھ لبوں کی طرف اٹھائے۔

"چیریو اعظم" راؤ نے مسکرا کر کہا اور پہلا گھونٹ پیا۔

"چیریو راؤ" اعظم نے آہستہ سے غمگین آواز میں جواب دیا اور راؤ کے ساتھ ہی ساتھ پہلا گھونٹ پیا۔ پھر دونوں نے گلاس میز پر رکھدیئے۔ گفتگو کی کوشش معلوم ہوتا تھا دونوں کر رہے تھے۔ اعظم اپنی اصلی حالت کو بھلا دینے کے لئے اور راؤ جس پر اعظم کی افسردگی کا اثر پڑتا جا رہا تھا اعظم کو کسی طرح سے تسکین دینے کے لئے۔ مگر جیسا اکثر ہوتا ہے، کوشش کرنے سے گفتگو نہیں ہوتی۔ دونوں پر ایک تکلیف دہ بھاری خاموشی چھا گئی۔ شراب پینے سے یہ کیفیت اور مستقل سی ہو گئی، بجائے اس کے کہ ان کی زبانیں کھلیں اور ان کے قلب میں حرارت پہونچے، تھوڑی سی شراب کا اس وقت الٹا اثر ہوا۔

"جین، جین، جین" اعظم کے دماغ پر اندر ہی اندر جیسے کوئی ہتھوڑا سا مار رہا تھا۔

اور راؤ اب اعظم کی اس حالت میں خود اتنا ڈوب گیا تھا کہ اس کے دوست کی تکلیف کا اثر خود اس تک پہنچ رہا تھا۔ "یہ روحانی کرب ایسا بھی نہیں جس سے انسان کو بالآخر تقویت پہنچتی ہو" راؤ نے سوچا "یہ تو بالکل بے فیض، لا حاصل اذیت ہے جس کا اثر سوائے دل اور دماغ کے معطل ہو جانے کے اور کچھ بھی نہیں۔ ہر اذیت

بے سود نہیں بعض تکلیفیں اس قسم کی بھی ہوتی ہیں جن سے ہمیں روحانی اور جسمانی فائدہ پہونچتا ہے یا ہمیں نہیں تو ہمارے تکلیف برداشت کرنے سے کسی اور کو فائدہ ہو۔"

راؤ کی آنکھوں کے سامنے یکبارگی ہندستانیوں کی ایک بھیڑ نظر آئی جس میں زیادہ تر غریب میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ تھے، جن کے چہروں پر دھوپ اور ہوا اور بھوک کے اثر سے جھریاں اور گڈھے پڑے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ مزدوری کرنے سے سخت اور مضبوط معلوم ہوتے تھے، جن کی آنکھوں میں محنت کی روشنی تھی، جن کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ جن کی ٹانگیں اُن کی میلی دھوتیوں سے لکڑی کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کی بھیڑ سڑک کے چوراہے پر۔ اس بھیڑ میں ملے جلے ہندستانی طالب علم، وہ بھی غریب، جن کو پچیس روپیہ مہینہ تک کی نوکری اب نہیں ملتی۔ دبلے پتلے، سینہ کمزور، چار دن سے داڑھی نہیں بنائی، چھوٹا انگریزی کوٹ اور دھوتی، میلی سی عینک، ننگے سر یہ بھی سیکڑوں کی تعداد میں۔ اور اسی طبقہ کے اور بہت سے لوگ۔ سارا مجمع ہل رہا ہے، سمندر کی سی لہریں آگے بڑھنے کی کوشش مگر راستہ رُکا ہوا ہے۔ گورے بندوقیں لئے ہوئے سامنے کھڑے ہیں، مشین گنیں بھی ہیں، سنگینیں دھوپ میں چمک رہی ہیں، سپاہیوں کے پیچھے گھوڑے پر سوار انگریزی افسر، تیز دھوپ، گرمی، چہروں پر پسینے کے قطرے نمایاں ہیں۔ ہوا بند۔ راؤ اس مجمع کے بیچ میں کھڑا ہوا ہے۔ آخر ہم آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ یہاں تک پہنچ کر رک جانے سے کیا فائدہ؟ اتنی دور تک آئے اور اب رُکے ہوئے ہیں۔ "آگے بڑھو" "آگے بڑھو" کی آواز یکبارگی اس کے کانوں میں آئی اور اس کے سارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

تکلیف جس سے کچھ فائدہ پہونچے، تکلیف جو آرام کی ہراول ہے۔ یہاں تک کتنی مشکل سے ہم پہونچے اور اب آگے بڑھنے والے ہیں، لیکن نہیں، نہیں

اور پی ہیں بد اعظم نے دو گلاس اور آرڈر کئے اور دونوں دوستوں نے پھر خاموشی کے ساتھ شراب پینی شروع کی۔

"آپ کے پاس دیا سلائی تو نہیں ہے؟" راؤ کے برابر ایک انگریز مزدور کھڑا ہوا تھا۔ اس نے راؤ سے پوچھا خاص مزدوروں کے لہجہ میں۔ راؤ مڑا اس نے سوال کرنے والے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکال کر مزدور کے ہاتھ میں رکھ دی۔ مزدور نے اپنا پائپ سلگانا شروع کیا جلتی ہوئی دیا سلائی کی روشنی اس کے چہرہ پر پڑی، وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا پینتیس چھتیس برس کا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں جو اس کے لبوں تک پہونچتی تھیں اور جن کے کنارے بیئر سے نم تھے۔ گہرا گلابی رنگ، ناک کچھ پھولی ہوئی سی، چھوٹی آنکھیں مگر ان میں تیزی، بھویں ہلکی بھوری۔ میانہ قد۔ کافی فربہ جسم، ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیاں۔ اس شخص کے کپڑے پرانے گہرے بادامی رنگ کے جو بالکل گھس گئے تھے، پتلون پر گھٹنے کے نزدیک پیوند۔ پائپ سلگا کر جب اس نے راؤ کو دیا سلائی کی ڈبیا واپس دی تو کہا۔

"ہندستان میں پھر گڑبڑ ہو رہی ہے!"

اعظم نے یہ سن کر اپنے دل میں کہا "پھر تم سے کیا مطلب! ہمیں ان باتوں سے دلچسپی نہیں۔ خواہ مخواہ ہم سے بات چیت کرنے کی خواہش مت کرو۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ اس وقت مجھے ہندستان میں گڑبڑ ہونیکی وجہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں۔" جاپن۔ جاپن اس کے سر میں ابھی تک کلہاڑے چل رہے تھے۔ وہ خاموش رہا۔

اور راؤ نے خیال کیا "یہ شخص کیوں ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے؟ ہندستان سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ہمیں غلام سمجھ کر دل بہلا۔ مزدور ہم سے نفرت کرتا ہوگا۔ اس کی اپنی حالت خراب ہے لیکن اکثر انگریزوں کی طرح ہندستان کو، ہمارے ملک کو، اپنی ذاتی ملک سمجھتا ہوگا۔ ہندستان میں گولی چلی اس کے بھائی بندوں نے

ہمارے بھائی بندوں پر گولی چلائی۔ یہ دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلانا اور صلح اور امن قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور یہ شخص مجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتا ہے؟" اس نے انگریز کو جواب دیا "ہاں ہندستان سے بری خبر آئی ہے لیکن مجھے کچھ پروا نہیں جتنی زیادہ ہندستان میں گڑبڑ ہو مجھے تو اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے" غصہ اور طنز سے بھرا ہوا کلمہ۔ لیکن اس ٹھوس انگریز مزدور پر راؤ کے غصہ اور طنز کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنے پائپ سے ایک کش لیا اور پھر بغیر کسی جوش وخروش کے جواب دیا "میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے فساد، گڑبڑ، خون خرابے کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوتی اور جب ہم انگریز ہندستان میں جا کر بغیر فوج کی رونزانہ مدد کے حکومت نہیں کر سکتے تو میں یہ کہتا ہوں" تھوڑی سی آواز اٹھا کر اس نے دہرایا "ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ اب اس بات کا وقت آگیا کہ ہم ہندستان سے اپنا بوریا بستر سنبھال کر گھر واپس چلے آئیں اور ہندستانیوں کو ان کا ملک حوالے کر دیں۔ وہ جو چاہیں اپنے ملک کو لے کر کریں۔ اور بہر صورت میں تو یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ ہمارے انگلستان پر جرمن، یا فرانسیسی یا اور کوئی قوم آکر حکومت کرے۔ تو پھر ہندوستان میں رہنے کا ہم کو کیا حق ہے؟" وہ دوسری طرف مڑا اور اپنے پاس والے مزدور کو خطاب کر کے کہا "کیوں جم۔ میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

جم جو لمبا اور دبلا تھا اور جس کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، اپنے ساتھی ٹام کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور سر جھکائے ہوئے اپنے بیئر کے گلاس پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ ٹام کی باتیں سن کر جم نے پہلے کچھ جواب نہیں دیا۔ راؤ کے دل میں جاگی۔ نفرت سی ٹام کی طرف سے گئی وہ اب دلچسپی سے بدل گئی۔ "یہ انگریز مزدور غالباً اتنے احمق نہیں جتنا انگلستان کے اخبار ڈیلی میل وغیرہ۔ ان کے دلوں میں

سچائی کے لئے ابھی تک تھوڑی سی جگہ باقی ہے لیکن" راؤ کو پھر غصہ آیا۔ "یہ کچھ کرتے کیوں نہیں!" راؤ نے جم کی طرف دیکھا۔ اُسے اُس کے جواب کا انتظار تھا۔ ٹام نے پھر جم سے کہا۔

"ویل جم، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹام" جم نے آہستہ سے کہا "لیکن اگر ہم ہندوستان کو چھوڑ دیں تو پھر اس ملک کی حالت کیا ہوگی۔ ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ وہاں ہندو اور مسلمان دو مذہب کے لوگ ہیں اور ان میں ہمیشہ آپس میں لڑائی ہوا کرتی ہے یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ اگر ہم ہندستان میں امن نہ قایم رکھیں اور اس ملک کو چھوڑ کر چلے آئیں تو ہندستان میں بہت خون خرابے کا ڈر ہے۔"

ٹام نے اپنا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ میں ساری بیئر ختم کر دی اور بآواز بولا "جم، میں تم سے کہتا ہوں۔ میری بات سنو! میں لڑائی کے پہلے ہندستان میں تھا اور میں نے وہاں کی حالت دیکھی ہے۔ اس وقت میں جوان تھا میں احمق تھا۔ سنتے ہو مجھے میں احمق تھا۔ برٹش امپائیر کا خیال کر کے میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔ میں ہندوستانیوں کو "کالا لوگ" "نگر" "نیٹو" کہہ کر خطاب کرتا تھا — میں ہندستانیوں کو جانوروں سے بدتر سمجھتا تھا۔ ہم لوگوں کو فوج میں سکھایا بھی جاتا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم ہندستانیوں میں کس طرح صلح قایم رکھتے ہیں! میں تم سے کہتا ہوں جم ہندستان میں ہماری حکومت کی بنیاد خوف پر ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہندستان میں ہماری وجہ سے امن قایم ہے۔ ممکن ہے۔ مگر امن کی قیمت کیا ہے؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے غریب ننگے، بھوکے جو کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں انسان مشکل سے تم یہ کہہ سکوگے کہ وہ انسان ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ہمارے یہاں بیکار مزدوروں کی حالت اس سے ہزار درجہ بہتر ہے اور اس پر بھی

یہاں یہ شور و غل مچا ہے۔ آئے دن جلسے ہوتے ہیں، جلوس نکلتے ہیں اور گورنمنٹ کو یہ جتلایا جاتا ہے کہ جب تک وہ بیکار مزدوروں کو اچھی طرح رہنے سہنے کا انتظام نہ کرے وہ مہذب گورنمنٹ کہلانے کے لائق نہیں۔ جم میری بات کا یقین مانو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ہندوستان میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر جگہ غربت ہی غربت دیکھی۔ ہم وہاں ڈیڑھ سو برس سے زیادہ سے ہیں اور صلح اور امن قایم کئے ہوئے ہیں! تم جب امن قایم رکھنے کی باتیں مجھ سے کرتے ہو تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا!

جم پر ٹام کی باتوں کا اثر تو ہوا مگر اس کے دل میں شبہ سا رہ گیا، ممکن ہو ٹام مبالغہ کرتا ہو۔ "ٹام تم ہندوستان جا چکے ہو، وہاں کی حالت دیکھ چکے ہو۔ مجھے جو کچھ ہندوستان کے بارے میں معلوم ہوا اخباروں سے ...... " جم نے ہچکچا کر کہا اخباروں میں ہمیشہ لکھا رہتا ہے کہ اگر ہماری حکومت ہندوستان میں نہ رہے تو اس ملک میں بدامنی اور فساد پھیل جائے گا۔ میں کچھ نہیں جانتا" جم نے سر ہلا کر کہا۔ "اخباروں میں یہ پڑھتا ہوں"۔ ٹام کو اب کافی سرور آچلا تھا۔ بحث کرنے سے اور زیادہ حرارت اس میں آگئی "جم" اس نے جم کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "بندۂ خدا! کیا تمہاری کھوپڑی بالکل خالی ہے؟" اس نعرے کو سُن کر اِدھر اُدھر جو لوگ تھے وہ سب اپنے اپنے گلاس لے کر ٹام اور جم کے نزدیک آگئے اور اُن کے گرد حلقہ سا بن گیا۔ سب ان کی گفتگو میں شامل ہونا چاہتے تھے۔

ٹام نے اپنی بات کو جاری رکھا۔ "تم کہتے ہو کہ تم نے یہ سب باتیں اخباروں میں پڑھی ہیں اس وجہ سے تم میری بات کا یقین کرنے سے انکار کرتے ہو۔ اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ اخبار ہمارے اپنے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ صحیح ہوتا ہے؟ جب کبھی ہم مزدور اسٹرائک کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو یہ اخبار ہمیشہ قصور ہمارا ہی بتلاتے ہیں۔ جیسے ہم کو

فاقہ کرنے اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹنے میں مزہ آتا ہے۔ کیا تم اس کو سچ سمجھتے ہو ؟
اور آج جو ہمارے بیکار مزدور جلسے کرتے ہیں اور جلوس نکالتے ہیں جس میں وہ گورنمنٹ
پر دباؤ ڈالیں اور سارے ملک کی توجہ اپنی بری حالت کی طرف مبذول کرائیں، تو
اخبار کہتے ہیں کہ وہ سب اٹھائی گیرے، نکمے، ماسکو کے زرخرید غلام ہیں۔ کیا یہ سچ
ہے ؟ بتاؤ تم خود بتاؤ۔ تم میرے لڑکے کو جانتے ہو، وہ ایک کپڑے کی فیکٹری میں کام
کرتا تھا۔ ایک برس سے بیکار ہاتھ پر ہاتھ دیئے بیٹھا ہے۔ سڑکوں پر مارا مارا گھومتا پھرتا ہے
نوکری کی تلاش میں، لیکن جہاں کہیں بھی جاتا ہے وہاں ٹکا سا جواب ملتا ہے۔ اس نے
کیا قصور کیا ہے ؟ اگر اس کو کام دیدیا جائے تو وہ ان لوگوں کو جو بڑی بڑی موٹروں
پر گھومتے پھرتے ہیں کام کرنا سکھا دے۔ میرے لڑکے کی طرح اس ملک میں ۳۰
لاکھ آدمی ہیں ایسے لوگوں کو ہمارے اخبار کہتے ہیں کہ بدمعاش اور پاجی ہیں اور تم
ایسے اخباروں کی باتوں کا یقین کرتے ہو۔ جم ذرا تو سمجھ کی باتیں کرو !"

جم بیچارہ یہ تقریر سننے کے بعد بالکل دب گیا، جو لوگ ادھر اُدھر کھڑے ہنس رہے تھے
تھے۔ انھوں نے بھی ٹام کو اس زور و شور سے سن کر اس کی طرفداری میں سر ہلانا
شروع کیا۔

جم نے آہستہ سے کہا "ٹھیک ہے ٹام، تمہارا ہی کہنا ٹھیک ہے۔ ان اخباروں
کی باتوں کا یقین کرنا حماقت ہے"

ٹام اب بچہ کی طرح خوشی سے مسکرانے لگا، جیسے اسے کوئی بڑی فتح ہوئی ہو۔
اس نے راؤ اور اعظم کی طرف نظر ڈالی اور مسکرا کر آنکھ ماری۔ گویا یہ کہنا چاہتا تھا کہ "جم
کو برا آدمی مت سمجھنا۔ دل اس کا بھی صاف ہے۔ ہندوستان کے حقوق کو وہ مانتا ہے
صرف ذرا سی بات تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اب وہ ہمارے ساتھ ہے"
"جم اب میری طرف سے ایک گلاس پیو" ٹام نے دو گلاس اور آرڈر کئے۔

ایک اپنے لئے اور ایک جم کے لئے۔ شراب کے اثر سے غریب سے غریب آدمی فیاض ہو جاتا ہے۔

"تھینک یو، ٹام"۔ جم نے مسکرا کر کہا۔ شراب والے نے بیر سے لبریز دو گلاس ان کے سامنے رکھ دیئے۔ جو لوگ گھیرے ہوئے کھڑے تھے وہ رفتہ رفتہ کر کے ہٹنا شروع ہوئے۔ ٹام اور جم نے ایک ایک گھونٹ بیر پی کر پائپ کے لمبے لمبے کش لئے۔ اعظم نے دل میں سوچا کہ جلدی کرنی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ جین نعیم کے یہاں جائے اور اعظم کو وہاں نہ پاکر واپس چلی جائے۔

اتنے میں کمرے کے ایک کونے سے ایک شرابی کی زوردار آواز آئی اس کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدمست ہے۔

"ہلو بلیکی!" اس نے اعظم اور راؤ کو پکار کر کہا۔ اعظم اور راؤ یکبارگی اس طرف مڑے۔ ننگے سر، ایک دُبلا پتلا آدمی پھٹے حالوں، لال ٹماٹر کا سا چہرہ بنچ پر بیٹھا ہوا بدمستی کی ہنسی ہنس رہا تھا۔ راؤ اور اعظم جن پر خود شراب کا اثر ہو رہا تھا، غصے سے کانپ گئے۔ ذلت، بے آبروئی، ہندستانیوں کی قسمت ہی میں لکھی ہے۔ دنیا کے جس حصے میں بھی وہ جائیں۔ غلامی کا ٹیکہ ہرگز ان کے ماتھے سے نہیں چھوٹ سکتا۔ راؤ اور اعظم دونوں نے یہی محسوس کیا۔

"گینڈی کیسا ہے ...... اس کی بکری اچھی ہے؟ میں ہندستان میں تھا۔ میں تین برس میں نہ تین برس ہندستان میں فوج میں تھا۔ میں نے کلکتہ، دہلی، آگرہ، میرٹھ، پشاور سب دیکھا ہے۔ کیل کٹا اچھا شہر ہے۔ میں نے خوب مزا کیا ہندوستان میں لٹل لڑکیاں بہت اچھی ہوتی ہیں .... ہلو کیا ہلو ہوا؟ میری طرف سب لوگ کیوں گھور گھور گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں؟"

اس نے اپنا گلاس اٹھا کر جو تھوڑی سی بیر بچی ہوئی تھی ایک گھونٹ میں

ختم کر دی۔

"ایک اور" اس نے چلا کر شراب والے سے کہا۔

اس شخص کے چلانے کی وجہ سے "پب" میں ہر شخص کی نظر اس کی طرف
تھی۔ انگریز مزدور اس کی طرف خاموشی سے اس طرح دیکھنے لگے۔ جیسے انھیں
اس کی یہ ناشائستہ حرکت بالکل پسند نہیں تھی کسی کے ماتھے پر تیوریاں تھیں کوئی
حقارت آمیز مسکراہٹ سے چلانے والے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اعظم کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح
سے وہ اس بدمست ذلت کرنے والے سے بدلہ لے۔ وہ اس کی طرف یوں گھور رہا
تھا جیسے اس کا بس چلے تو وہ اس شخص کو کچا کھا جائے۔ جین کا خیال اس وقت اس
کے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ راؤ نے چلانے والے کی طرف ذرا دیر دیکھ کر اس کی طرف
سے منہ پھیر لیا۔ اور اپنے شراب کے گلاس پر نظر گڑا کر آہستہ سے کہا "سور کا بچہ"
اور پھر گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ اپنی شراب پینی شروع کی اس کا سر اب کچھ کچھ چکرانے
لگا تھا۔ چاروں طرف خاکی کپڑوں میں گورے بائیسکلوں پر اس کے گرد ایک
عظیم الشان حلقہ بنائے ہوئے ہیں اور بیچ بیچ میں وہ کھڑا ہوا ہے، بالکل اکیلا اس
کو ہاتھ میں شراب کا ایک گلاس ہے۔ آدھا بھرا ہوا۔ ہزاروں لاکھوں گورے سائیکلو
پر۔ یکایک رات ہو گئی۔ اندھیرا گھپ صرف گوروں کی سائیکلوں کے لمپ کی روشنی
راؤ کو دکھ معلوم ہوا۔ اسی کے گرد سائیکلوں کا حلقہ چھوٹا ہونے لگا۔ سائیکلوں پر گورے
اس کے قریب آنے لگے۔ ایک منٹ میں وہ بالکل اس کے قریب پہنچ جائیں گے
یا خدا وہ اس بلا سے کیسے نجات پائے۔ ایک سکنڈ میں وہ پس جائے گا۔ اس پر خوف
طاری ہوا۔ اس کا بدن تھر تھرانے لگا ہائیں ہائیں اسے مردانگی کے ساتھ اس بلا کا
سامنا کرنا چاہیے۔ اس نے شراب کا گلاس زمین پر ٹپک دیا۔

پھر

تڑ سے گلاس ٹوٹنے کی آواز آئی اور سب کی نظر راؤ پر پڑی۔

راؤ خود چونک سا گیا۔ اس نے شراب والے کی طرف دیکھ کر کہا "آئی ایم سارّی معاف کرنا۔" "کچھ مضائقہ نہیں سر" اس نے مسکرا کر جواب "اس بدمست آدمی کے چلاّنے کا آپ لوگ نوٹس مت لیجئے۔ بس ایک ہی گلاس پی کر اس کے ہوش درست نہیں رہتے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو پریشان کیا" شراب خانے والے نے اعظم اور راؤ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

شرابی اب کسی اور سے چلاّ چلاّ کر باتیں کر رہا تھا۔

اعظم راؤ کی طرف مڑا "معلوم ہوتا ہے تمہارا سر چکرا رہا ہے۔ یہاں دھواں بہت ہے۔ چلو چلیں۔"

دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ شام اور رحیم کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں ساتھ ساتھ اعظم اور راؤ کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ اور "گڈ ایوننگ" کہا۔

اعظم اور راؤ بغیر جواب دیے تیزی سے "پب" سے باہر نکل آئے۔ اور ان دونوں پر ایک اندوہگیں سکوت چھا گیا۔

Affal
12/11

۳

نعیم الدین۔ ان طالب علموں کے زمرہ میں تھا جو ہندستان سے دو یا تین برس کی تعلیم کے لئے انگلستان جاتے ہیں اور وہاں جاکر پانچ چھ برس تک رکتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے والدین کو خواہ مخواہ ستانا چاہتے ہیں اور ان پر انگلستان میں معینہ میعاد سے زیادہ رہنے کا بار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی نہیں کہ وہ کند ذہنی کے سبب امتحان نہیں پاس کر سکتے بلکہ اس لئے کہ ان کو سستی کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ وہی لوگ جو شروع میں اپنی ذہنی اور جسمانی تیزی کا ثبوت دیتے ہیں سال چھ مہینہ وہاں رہنے کے بعد رفتہ رفتہ سست ہونا شروع ہوتے ہیں۔ انگلستان میں جیسے چپک سے جاتے ہیں۔ طالب علم ہندستان سے لندن آتے تھے اور طالب علم لندن سے ہندستان واپس جاتے تھے۔ مگر نعیم الدین ٹس سے مس ہونے کا نام نہ لیتے۔

نعیم الدین! آخر تمہاری تھیسس کب ختم ہوگی؟ لوگ اُن سے پوچھتے۔

" پانچواں باب لکھ رہا ہوں۔ چند ہفتوں میں وہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد بس ایک باب اور لکھنا ہے۔ مہینہ دو مہینہ میں اسے پیش کر دوں گا " نعیم الدین ہمیشہ یہی جواب دیتے اور اس خوف سے کہ لوگ کہیں یہ نہ کہیں کہ چھ مہینہ قبل بھی انہوں

نے یہی جواب دیا تھا' وہ فوراً بات ٹالنے کی کوشش کرتے "یہ سگریٹ پیو" وہ سوال کرنے والے کے سامنے سگرٹ پیش کر کے کہتے' اور اگر انھیں خوف ہوتا کہ وہ شخص بغیر بات کی تہہ تک پہونچے ہوئے رُکنے کا ارادہ نہیں رکھتا' تو نعیم الدین "ذرا معاف کرنا" کہہ کر اپنی آرام کرسی سے اٹھتے گردن جھکی ہوئی' منہ میں پائپ دبا ہوا۔ بھکا بھک انجن کی طرح دھواں نکالتے ہوئے مع اپنے فربہ جسم کے تیزی سے کمرے سے باہر نکل جاتے اور غسل خانہ میں جا کر نجات پاتے۔ ان کے دوست ان چالوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور یہ نعیم الدین کی چڑھ نکال لی تھی۔ گفتگو کے درمیان یا غیروں کے سامنے جب نعیم الدین اپنی عادات کے مطابق زور و شور سے باتیں کرتے ہوتے تو کوئی نہ کوئی اُن سے ضرور پوچھتا "نعیم' تم اپنی تھیسس کب پیش کر دگے ؟" ایک دم نعیم بولتے بولتے رُک جاتے اور سوال کرنے والے کی طرف جھنجلا کر دیکھتے "میری تھیسس سے یہاں کسی کو دلچسپی نہیں:" اور پھر اپنی پہلی گفتگو جاری رکھنے کی بے تحاشہ کوشش کرتے۔ اس پر ان کے دوست سب قہقہہ مار کر ہنستے۔

نعیم سے سب کو اک محبت تھی وہ ہمیشہ ہر شخص کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتے اور ان سے وہ لوگ بھی جو اُن کے دوست نہیں تھے' جائز ناجائز فائدہ اٹھاتے کبھی کسے پاس روپیوں کی کمی ہوئی اور وہ نعیم کے یہاں قرض مانگنے پہونچا کبھی کو وقت پر امتحان کی فیس داخل کرنے کی فرصت نہ ہوتی تو وہ نعیم سے کہتا تھا کہ جا کر داخل کر آئے۔ کبھی کو مفت دعوت کھانی ہوتی تو وہ نعیم کے یہاں کھانے کے وقت آکر ڈٹ جاتا کبھی کے پاس تازہ ترین ناول پڑھنے کے لئے نہ ہوتے تو وہ نعیم کی کتابیں بے تکلفی سے اٹھا کر لے جاتا' کبھی کو ٹائپنگ کرنی ہوتی تو وہ نعیم کے یہاں پہونچ کر اس سے لفافوں پر پتے لکھواتا۔ کبھی کی معشوقہ اگر اسے داغ فراق دے جاتی تو وہ دلجوئی کے لئے نعیم کے یہاں آتا۔

نعیم الدین ہمیشہ پہلے انکار کرتے "مجھے کہاں فرصت!" یا "میں غریب آدمی میرے پاس پیسے کہاں کہ تم کو قرض دوں" یا "اس وقت ذرا مجھے پڑھنا ہے اس وجہ سے میں تمہارا کام نہیں کر سکتا۔"

لیکن سب کو معلوم تھا کہ پانچ منٹ کے اصرار کے بعد نعیم الدین کو ان کی آرام کرسی سے جس پر وہ صبح سے شام تک اپنا "گاؤن" پہنے بیٹھے ہوئے ناول پڑھا کرتے اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور پھر وہ دوسروں کی مدد کرنے میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی سستی کو بالائے طاق رکھ دیتے۔

نعیم الدین کا کمرہ ان کے دوستوں اور ان کے جان پہچان والے لوگوں کے لئے کلب کا بھی کام دیتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن شام کو چھ سات آدمی ضرور وہاں پہنچ جاتے اور پھر گفتگو کا سلسلہ چھڑ جاتا جو رات کے بارہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ آج رات کو بھی نعیم کے یہاں پارٹی تھی۔

کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی "ہاں چلے آؤ" نعیم نے جواب دیا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر آتشدان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا' آہستہ آہستہ کر کے۔

یہ کون ہے نعیم نے اپنے دل میں سوچا جو فوراً چلا نہیں آتا بلکہ دروازے پر پہونچ کر یوں جھجک رہا ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلی دفعہ آیا ہے۔

کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ صرف ایک لیمپ ،جس پر گہرے سرخ رنگ کا گلوب لگا ہوا تھا ایک کونے میں نیچی سی میز پر روشن تھا۔ آتش دان میں، آگ دہک رہی تھی

"چلے کیوں نہیں آتے؟" نعیم نے چلا کر دوبارہ کہا۔ ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی اس کی صورت اندھیرے میں اچھی طرح دکھائی نہیں دی۔ میانہ قد گدرانا جسم، سیاہ لمبا کوٹ اور سیاہ ٹوپی جس کا چھجا اس کے ماتھے اور آنکھوں کے

اوپر ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کو چھپاتے ہوئے تھا۔ اس کی چال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندر آتے ہوئے جھجک رہی ہے نعیم الدین حیران چپ کھڑا رہا اور آنے والی پر اس کی نظریں، کہنے "یہ ابھی سے کون آگیا جسے میں جانتا تک نہیں لیکن لڑکی معلوم ہوتی ہے ان لوگوں کی طرح نہیں جو جان نہ پہچان دھڑلے سے میرے کمرے میں گھس آتے ہیں"

عورت نے دروازہ بند کیا اور ایک دو قدم آگے بڑھ کر نعیم کی طرف آئی۔ اب اس کے چہرے پر روشنی اچھی طرح پڑی "یہ لڑکی بدصورت نہیں" نعیم نے اپنے دل میں کہا۔

"معاف کیجئے گا" لڑکی نے کہا "کیا یہ مسٹر نعیم کا کمرہ ہے؟"

"میرا ہی نام نعیم ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔ نعیم نے آتشدان کے پاس سے بغیر ہلے ہوئے جواب دیا۔

لڑکی اب آگے بڑھ کر نعیم کے پاس آگئی۔ کرسی کے نزدیک لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کے گلابی گال جو سردی کی وجہ سے اور گلابی ہوگئے تھے۔ اور ٹوپی کے نیچے سے نکلے ہوئے سنہرے بال جو گردن تک پہنچتے تھے اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو نعیم کے چہرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے لبوں کی ہلکی سی مسکراہٹ جس سے کچھ تجاہل سا معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ہلکی ہلکی سرخ روشنی میں عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے۔

وہ کرسی کے پیچھے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اب اس کے اور نعیم کے درمیان صرف یہ بڑی سی آرام کرسی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کرسی پر رکھ دیئے۔ اس کی انگلیوں میں خفیف سی حرکت تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی مٹھی آدھی بند ہوتی اور پھر کھل جاتی لیکن نعیم کی نظر اس کے ہاتھوں پر نہیں پڑی۔ وہ اس کی طرف استعجاب اور حیرت سے

دیکھتا رہا۔

"مسٹر راؤ نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو آپ کے یہاں پارٹی ہے۔ انھوں نے مجھ سے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا، ساڑھے چھ سات بجے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے۔"

لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کچھ معذرت کے لہجہ میں کہا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے کو بن بلایا مہمان سمجھ کر ایسے شخص کے یہاں آنے سے جسے وہ جانتی تک نہیں شرمندہ ہے۔

"ہاں ہاں!" نعیم نے جلدی سے کہا "آپ تشریف رکھئے۔ راؤ کو کسی وجہ کر دیر ہو گئی ہوگی۔ آج یہاں پارٹی تو ہے .... راؤ تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے ....آپ اپنا کوٹ اور ٹوپی اُتار دیجئے، باہر بارش ہو رہی ہے نا۔ آپ کے کپڑے بھیگ گئے ہوں گے۔"

"جی ہاں" لڑکی نے کوٹ اور ٹوپی اتارتے ہوئے کہا "ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے اور کہرا اس قدر ہے کہ دم گھٹتا ہے۔" .... اور پھر ذرا تھم کر اس نے کہا "راؤ نے آپ سے میرے یہاں آج آنے کے بارے میں ذکر تو کیا ہوگا۔"

نعیم نے لڑکی کا کوٹ اور ٹوپی کونے میں ایک کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ پھر جب وہ مڑ کر آتشدان کی طرف آیا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی آئینہ کی طرف منہ کئے ہوئے جو آتشدان کے اوپر کارنیس پر لگا ہوا تھا، اپنے بال ٹھیک کر رہی ہے اک ذرا دیر کے لئے، آدھے منٹ سے بھی کم۔ اس کے بعد وہ آتشدان کے بالکل قریب آگ کی طرف سر جھکا کر کھڑی ہو گئی اور اپنے ہاتھ گرمانے لگی وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھی سیاہ اونی لہنگا اور اسی کپڑے کا ایک چھوٹا سا سیاہ کوٹ اس کوٹ کے نیچے بہت گہرے نارنجی رنگ کا سوئٹر جو اس کے گلے کے چاروں طرف سے اور سامنے

کوٹ کے کھلے ہوئے حصّہ سے دکھائی دیتا تھا۔ آگ دہک رہی تھی اور اس کے ابھرتے ہوئے شعلوں کی روشنی رہ رہ کر اس لڑکی کے چہرہ کو چمکا دیتی تھی۔

نعیم الدین کو یہ لڑکی پسند آئی "بیچاری نیک معلوم ہوتی ہے" اس نے اپنے دل میں خیال کیا "اور سمجھدار بھی۔ تعجب ہے کہ راؤ نے کبھی پہلے مجھ سے اس لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہ بھی اس نے مجھ سے نہیں کہا کہ آج اسے مدعو کیا ہے لیکن ان کی تو اتنی لڑکیوں سے دوستی ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں! معلوم ہوتا ہے یہ تازہ ترین ہے۔ اب اسے میں کیا جواب دوں۔ اگر یہ کہتا ہوں کہ راؤ نے مجھ سے اس کا ذکر پہلے نہیں کیا تو وہ بیچاری خواہ مخواہ شرمندہ ہوگی، دل میں سوچے گی کہ کہیں ہیر پھیر تو نہیں ہو رہی ہے راؤ بھی عجب آدمی ہے، آخر میرے یہاں بلایا تھا تو کم از کم مجھ سے تو کہہ دیا ہوتا۔ نعیم دل ہی دل میں جھنجھلایا: "اب میں کیا کروں خواہ مخواہ مجھے اس نے اس کشمکش میں پھنسایا۔ آخر میں اسے کیا جواب دوں۔ نعیم الدین کی گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی "کیا کروں! کیا کہوں!" اس کے سست ذہن میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا۔

لڑکی خاموش آتشدان کے پاس کھڑی ہوئی اپنے ہاتھ گرماتی رہی اسے یاد بھی نہیں رہا کہ اس نے کوئی سوال کیا تھا۔ اس کے چہرے سے اطمینان معلوم ہوتا تھا۔ راؤ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ شاید میں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئی، لیکن اچھا ہی ہوا۔ کیا اچھی آگ یہاں جل رہی ہے، اور یہ موٹا سا ہندوستانی طالب علم یہ بھی بیچارہ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

نعیم الدین کی پریشانی اب بہت بڑھ گئی تھی "آخر کچھ تو کرنا چاہیئے" وہ اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ کمرے کے دوسرے سرے کی طرف گیا، اور اپنے کوٹ کے جیب سے جو کھونٹی پر ٹنگا ہوا تھا گھبرا کر سگریٹ کیس نکالا اور لپک کر لڑکی کے

پاس آیا۔

"سگریٹ نوش فرمایئے" اس نے ہانپتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

لڑکی نعیم کی طرف مڑی "بہت بہت شکریہ" اور یہ کہہ کر اس نے کیس میں سے ایک سگریٹ نکال لیا۔ نعیم الدین نے خود بھی لیا اور پھر دونوں نے سگریٹ جلائے۔ اب نعیم کو ذرا سکون ہوا "خیر بات ٹل گئی"۔

"آپ اس کرسی پر آرام سے بیٹھیے"۔ اس نے گفتگو شروع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ! آگ کے قریب مجھے بہت آرام ہے .... لیکن .... اچھی بات ہے میں بیٹھتی ہوں۔ یہ کرسی بھی تو آگ کے پاس ہے۔ مگر میں نے آپ کی کرسی چھین لی۔ آپ خود کہاں بیٹھیں گے؟" لڑکی نے ہنس کر کہا۔

"میری فکر نہ کیجیے میں اس دوسری کرسی پر بیٹھ جاؤں گا"۔ اس نے ایک چھوٹی سی بے ہتھے کی کرسی آگ کے قریب، بڑی کرسی کے سامنے کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔

"آخر یہ کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ داؤ اس سے کہاں ملا ہوگا۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ خوبصورت۔ لیکن میں؟ مجھے کوئی خوبصورت کہہ سکتا ہے؟ مجھ پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہوتی۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے۔ میں موٹا بہت ہوں۔ میرے اور عشق کے درمیان میری توند حائل ہے۔ معلوم نہیں یہ لڑکی مجھے کیسا سمجھتی ہے۔ توند سے کیا ہوتا ہے۔ اکثر دنیا کے بڑے بڑے انسانوں کے توندیں تھیں، لیکن اگر توند نہیں تو پھر کون سی چیز۔ شاید مجھے عورت سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ اب یہ لڑکی اتنی دیر سے یہاں ہے اور مجھ سے ایک بھی ٹھکانے کی بات نہیں کی جاتی۔ اپنے دل میں خیال کرتی ہوگی کہ کتنا غیر دلچسپ اکھاڑ آدمی ہے، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ ایسے لوگ جن کو

دو لفظ بھی ٹھکانے سے نہیں بولے جاتے عشق میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر آخر مجھ میں کون سی کمی ہے؟ میرے دوست خیال کرتے ہیں کہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں۔ اچھی صورت دیکھ کر مجھ پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ غلط! بالکل غلط۔ "مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد" دوسرا مصرعہ اس وقت یاد نہیں آتا۔ کیا یہ سچ ہے کہ میرا حافظہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے؟ میں یہاں برسوں سے اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ میں کند ذہن تو نہیں ہو گیا؟ اسکول میں جو ایک لڑکا میرے ساتھ بیٹھتا تھا اس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں تھی اور حساب میں وہ بیچارہ ہمیشہ فیل ہوتا تھا۔ میں تو کبھی اپنے اسکول اور کالج کے امتحانوں میں فیل نہیں ہوا، ہمیشہ شان کے ساتھ پاس ہوتا تھا۔ میں کند ذہن! کون کہتا ہے۔ میر اور غالب کے جتنے شعر یاد ہیں شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔ مجھ سے کوئی بیت بازی کرے۔ دیکھیں کون جیتا ہے۔ کیا اس وقت ایک حرف بھی مجھ سے بولا نہ جائے گا۔ اتنی دیر سے یہ بیچاری بیٹھی ہوئی ہے اور میں نے اس سے ایک بات بھی نہیں کی!"

"کیا آپ بھی مسٹر راؤ کی طرح قانون پڑھتے ہیں"! لڑکی نے پوچھا۔ وہ کرسی پر اب آدھی لیٹ گئی تھی اور سگرٹ کا دھواں اس کے چہرے اور بالوں پر ایک پتلے سے نیلے نقاب کی طرح چھایا ہوا تھا۔

"دیکھا نا! آخر میری خاموشی سے تنگ آ کر اسی کو بولنا پڑا!" نعیم نے اپنے دل میں کہا۔ "جی نہیں"! اس نے جواب دیا "میں تاریخ کا طالب علم ہوں، لندن یونیورسٹی کی ڈاکٹری کی کوشش کر رہا ہوں۔" "کوشش" یہ لفظ میں نے خوب استعمال کیا، نعیم نے سوچا میرے ساتھ جن لوگوں نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ وہ کب کے ختم بھی کر چکے۔ نعیم کو اپنے اوپر کچھ ہنسی سی آئی۔ لیکن وہ اسے پی گیا۔ اس کی نظر اس لڑکی کی ٹانگوں کے اس حصہ پر پڑی جو چند انچ اس کے لہنگے کے باہر تھا۔

"کیا آپ بھی طالب علم ہیں؟" نعیم نے لڑکی سے پوچھا۔ "آخر میں نے پہلے ہی یہ سوال کیوں نہیں کیا۔" "نہیں اور ہاں" لڑکی نے ہنس کر جواب دیا۔ "میں پارسال تک یونیورسٹی کالج میں پڑھتی تھی۔ پھر میرے پاس فیس دینے کے لئے کافی روپے نہیں رہے۔ تو مجھے کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اب میں دن کو ایک دفتر میں کام کرتی ہوں اور ہفتہ میں چار دفعہ رات کے کالج میں لکچر سننے جاتی ہوں جہاں مجھے برائے نام فیس دینا ہوتی ہے۔"

یہ جواب نعیم کے سینے میں تیر کی طرح لگا۔ وہ جس کے پاس روپیوں کی کوئی کمی نہیں، جسے اپنی روزی کمانے کی فکر نہیں کیا کرتا ہے؟ وہ کس طرح اپنے اوقات گذارتا ہے؟ اس کی تھیسس ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ وہ اپنے دوستوں کے مذاق کا مستقل نشانہ بن کر رہ گیا ہے ...... لیکن ہندوستانی تاریخ کے ایک تاریک عہد پر تھیسس لکھنا اور بات ہے اور شام کو گھنٹہ دو گھنٹے لکچر سن لینا، جو ایک کان سے سنا، دوسرے اڑا دیا، اور بات ہے۔ میری تھیسس جب تیار ہوگی تو وہ علم تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگی۔

"آپ کس مضمون پر لکچر سننے جاتی ہیں؟"

"آرٹ اور فلسفہ پر" لڑکی نے جواب دیا۔ "آپ کو ان مضامین سے دلچسپی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آرٹ اور فلسفہ! یا اللہ خیر، یہ تو بڑی عالم فاضل صاحبزادی معلوم ہوتی ہیں میں اس کے سوال کا کیا جواب دوں؟ کیا مجھے آرٹ اور فلسفہ سے دلچسپی ہے؟ اگر میں نے ہاں کہہ دیا اور اس نے آرٹ اور فلسفہ پر باتیں چھیڑ دیں اور میں نے کوئی حماقت کی بات کر دی تو پھر یہ اپنے دل میں کیا سوچے گی! یا کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف مجھ پر رعب جمانے کے لئے اس نے مجھ سے یہ کہا ہے؟"

"دلچسپی تو مجھے ضرور ہے" نعیم نے جواب دیا۔ "لیکن میں نے کبھی ان مضامین کو اچھی طرح سے پڑھا نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دراصل آرٹ ٹھیک سے میری سمجھ میں آیا ہے یا نہیں۔ رہ گیا فلسفہ اس کا ماہر ہونے کے لئے تو ایک عمر درکار ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ کو ایسے خشک مضمون سے دل چسپی ہے۔ عورتیں تو عام طور سے ادبیات میں زیادہ دل چسپی لیتی ہیں۔"

"آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں ان مضامین میں بہت ماہر ہوں۔ اسکول اور کالج میں ادبیات پڑھتے پڑھتے میں عاجز آگئی۔ مجھے دو برس تک لٹریچر سے اتنی دل چسپی تھی۔ خصوصاً شاعری سے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن اب مجھ میں عجیب تبدیلی ہو گئی ہے۔ شاعری کا خیال کر کے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فلسفہ سچ پوچھئے تو خاک میری سمجھ نہیں آتا۔ لیکن اس کے لکچر سننے اور اس کی کتابیں پڑھنے سے مجھے اطمینان سا ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی بڑے مصور کی کھینچی ہوئی تصویر دیکھنے سے دل کو سکون ہوتا ہے......" لڑکی کی آنکھیں جو نیچی تھیں اٹھیں اور اس نے نعیم اور بین کی طرف دیکھا۔ "لیکن آپ کہتے ہوں گے کہ یہ کیا خرافات میں بک رہی ہوں" اس نے ایک غمگین سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

نعیم دل ہی دل میں شرمندہ تھا "کیسے میرا خیال بھی اس طرف گیا کہ یہ محض بڑا بننے کے لئے اس طرح کی باتیں کرتی ہے۔ کیا اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں اس کی سچائی کی گواہ نہیں؟"

"نہیں نہیں آپ بالکل یہ خیال نہ کیجئے۔ میں آپ کی باتیں بڑی دل چسپی سے سن رہا ہوں۔ مجھے اس کا موقعہ بہت کم ملتا ہے کہ یہاں کی سمجھ دار عورتوں سے باتیں کروں، اور ہمارے یہاں ہندستان میں تو آپ جانتی ہیں کہ مرد اور عورتیں خصوصاً نوجوان اس طرح سے بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے

.... نعیم نے معذرت کے لہجہ میں کہا۔" لیکن اسے چھوڑیئے آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپ کو لٹریچر خصوصاً شاعری سے کیوں دلچسپی باقی نہیں رہی؟ ہمارے یہاں تو ہر پڑھا لکھا آدمی شاعری میں ڈوبا رہتا ہے اور بات چیت کے درمیان، تقریروں میں مضامین کے اندر ہر جگہ مناسب شعر پڑھنا قریب قریب ضروری ہے۔

"کیا آپ کے یہاں ہر وقت لوگ شعر پڑھا کرتے ہیں!! اس سے بڑھ کر اور خوفناک حرکت کیا ہو سکتی ہے! اگر مجھے اس قسم کی سوسائٹی میں رہنا ہو تو پاگل ہو جاؤں شاعری، اچھی شاعری کا اثر میرے اوپر ویسا ہوتا ہے جیسے گرمیوں کی خوشگوار رات اور چاندنی کا۔ جب دن کی روشنی کو ہم بھول جاتے ہیں، اور ہر چیز پر، ہر بدہیبت، بدصورت، بیکار چیز پر پردہ پڑ جاتا ہے، ایسا پردہ جو انھیں بالکل چھپاتا نہیں بلکہ صرف ان کے عیوب کو جو دن کے وقت آنکھوں میں چبھتے ہیں، ڈھانک دیتا ہے۔ یہ دھوئیں کا نارو پہلا نقاب ہمارے دل اور ہمارے ذہن دونوں پر چھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری روح کبھی مسرت کے ایک بے پایاں سمندر میں غرق ہو جاتی ہے اور کبھی .... اس کے درد کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔"

معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے اس کی نظر آگ کے شعلوں پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ اڑ گئی اور وہ کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے رک کر اس نے کہا:" اسی وجہ سے مجھے شاعری اب پسند نہیں۔ میں اس کے اثر کو برداشت نہیں کر سکتی۔

نعیم کے دل میں بے ساختہ خواہش ہوئی کہ وہ اس لڑکی کے حالات معلوم کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بولتی چلی جائے، اس کی آواز بہتے ہوئے چشمے کی آواز کی طرح تھی نعیم نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود بیچ میں بولے وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود اپنی آواز سنے" یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔ اس کی زندگی دلچسپیوں سے لبریز ہوگی، کیا یہ عشق

میں مبتلا ہے ؟ کیا معلوم اس کا عشق کس قسم کا ہے ؟" اسے ضرور اپنے عشق میں مایوسی ہوئی ہوگی جبھی اس طرح سے باتیں کر رہی ہے۔ اس کا عاشق کس قسم کا آدمی ہوگا۔ ؟"

نعیم نے محسوس کیا کہ اسے یہ خیال تک بُرا معلوم ہوا" مجھ سے کیا مطلب لیکن جب بھی۔ اس کی باتوں میں مایوسی ملی ہوئی ہے" نعیم کو اس خیال سے خوشی سی ہوئی "یہ گفتگو کرتے کرتے یکبارگی رُک کیوں گئی ؟ مجھے اب کچھ کہنا چاہیئے! کیا کہوں ؟ اس کی پنڈلیاں کتنی خوبصورت ہیں اور اس کی انگلیاں بھی۔ اسے کچھ پریشانی سی ہو رہی ہے۔ کہیں مجھے کھٹّس اور غیر دلچسپ تو نہیں سمجھ رہی ہے ؟ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں ؟ یہ خاموشی تکلیف دہ ہوتی جا رہی ہے۔ شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ آگ کے شعلوں کو دیکھو کس طرح سے ناچ رہے ہیں۔ میں موٹا ہونے کی وجہ سے ناچتے وقت ضرور بدنما معلوم ہوتا ہوں گا۔ آخر میں کیوں موٹا ہوں ـــ ؟ سب میری اپنی سستی کا نتیجہ ہے۔ فرانسیسی شاعر تھا: جس نے کہا ہے: ـ سستی زندہ باد! یہ ہے میری معشوقہ۔ یہ مصرعہ مجھ پر بالکل صحیح اترتا ہے۔ کیا موٹا ہونا بہت بُرا عیب ہے ؟ بہت موٹا تو میں نہیں معلوم نہیں یہ لڑکی مجھے دیکھ کر اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی! کیا معلوم شاید اس کا خیال میری طرف بالکل گیا ہی نہ ہو۔۔ کس قدر یہ اپنے خیال میں محو معلوم ہوتی ہے۔ مگر مجھے کچھ تو اب کہنا چاہیئے تھا ـــ یہاں ناچنا کتنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بھانڈوں اور طوائفوں کا پیشہ اور اگر مرد اور عورت کو ساتھ مل کر ناچتے ہوئے ہمارے مولوی صاحبان ملاحظہ کریں تو ان کے دل کی حرکت رک جائے ہماری شاعری دراصل ....

"ممکن ہے ہم ہندستانیوں کے سست ہونے کی یہی وجہ ہو کہ ہم ہر وقت شاعری میں ڈوبے رہتے ہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ شاعری کا اثر ہمارے دل اور دماغ

کو تھوڑی دیر کے لئے معطل کر دیتا ہے۔ یا کم از کم انھیں اصلیت سے ہٹا کر ایک خیالی
دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ اور خیالی دنیا میں رہتے رہتے ہم اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ
مکان و زمان کی حقیقت بھول جاتے ہیں۔ اور مکان و زماں چونکہ لامتناہی ہیں اس لئے
ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بھی لامتناہی ہیں۔ ہر انسان کے دل میں اپنے کو زندہ جاوید سمجھنے
کی چھپی ہوئی خواہش ہوتی ہے۔ شاعری کے ذریعے سے ہم اپنی یہ پیاس بجھاتے ہیں۔ عقل
ہم سے کہتی ہے کہ یہ سراسر حماقت ہے۔ لیکن شاعری کے ذریعے سے ہم عقل کو بھی زیر کر سکتے
ہیں۔ ہماری شاعری عقل کی برائیوں سے بھری پڑی ہے۔ عقل ہمیں مشکلوں اور تکلیفوں
کی طرف کھینچتی ہے۔ عقل ہمیں دھوکا دے سکتی ہے۔ لیکن شاعری کی شراب! آپ نے خود
کہا کہ اس کا اثر ہمیں مست کر دیتا ہے اور اگر ہمیں یہ مستی، بے خودی کی حالت، یہ
بے عقلی، کبھی خوشی اور کبھی غم کے دریا میں اس طرح غرق کر دیتی ہے کہ ہم اپنی انسانیت
تک کو بھول جاتے ہیں۔ اور محض ایک نغمۂ مسرت یا نالۂ جانگداز ہو کر رہ جاتے ہیں تو ہمیں
اس چیز سے پرہیز نہیں کرنا چاہیئے۔"

نعیم یکایک رک گیا۔ "میں کیا بے سمجھے بولتا جا رہا ہوں۔ کہیں یہ لڑکی یہ نہ خیال
کرے کہ صرف اپنی فلسفیت کا ثبوت دینے کے لئے میں اس طرح کی باتیں کر رہا ہوں۔"
لیکن اسے کچھ خوشی سی تھی۔ آخر کچھ تو اس سے بولا گیا۔ یہ لڑکی مجھے بالکل ہی بے وقوف
تو نہیں سمجھے گی۔ میں دراصل بے وقوف نہیں، کافی مجھ میں سمجھ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے
کہ موقع پر کبھی کبھی ٹھیک چبھتا ہوا جواب مجھ سے نہیں دیا جاتا۔ اس لڑکی کے لب
کتنے اچھے ہیں اور بغیر لالی لگائے ہوئے عنابی ہیں اس کا نام کیا ہے؟ اس نے مجھے
اپنا نام کیوں نہیں ابھی تک بتایا؟ اس کے بال! کاش کہ میں انھیں چھو سکتا۔ تو یہ کیا
کیا بے تکے خیال مجھے آ رہے ہیں۔ نغمۂ مسرت یا نالۂ جاں گداز۔ ظفر کا شعر یاد
آ رہا ہے۔

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے سُن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں

اور غالبؔ :-

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن　　شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اور میرؔ :-

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ اٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

اور میرانیس :-

یک بیک طبل بجا، فوج کے گرجے بادل　　کوہ تھرائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل

طبل کی آواز، رونے کی آواز، نغمہ کی آواز اور دل کے ٹوٹنے کی آواز۔ اس لڑکی کے بولنے کی آواز مجھے کیوں پسند ہے؟"

"آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے۔ لیکن افسوس! ہم گانے گا کر زندگی کی تلخ حقیقت کو نہیں بھلا سکتے" لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ہمیشہ کے لئے نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے بھی نہیں؟ زندگی کی حقیقت اگر تلخ ہے تو اسے بھلا نا ہی بہتر ہے۔"

"نہیں، ہرگز نہیں، حقیقت کو بھلا دینا کبھی بہتر نہیں ہو سکتا۔ اس خواب سنہرے خواب کے بعد جب ہماری آنکھیں کھلیں گی تو زندگی کو ہم اور زیادہ تلخ اور زیادہ تاریک اور زیادہ مشکل پائیں گے۔"

"اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ زندگی، ساری زندگی ایک تکلیف دہ، ناقابل برداشت، بھاری بوجھ ہے اور ہم کبھی بھی اس سے نجات نہیں پا سکتے! یہ خیال تو ہولناک ہے۔ آپ کیسے ایسا عقیدہ رکھ کر زندہ رہ سکتی ہیں؟"

"مجھے خود اس بات پر تعجب ہوتا تھا! میں کیوں زندہ ہوں؟ میں خود سے سوال
کیا کرتی تھی۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں اس سے
بھاگنے کی کوشش کرتی تھی۔ زندگی کی روانی مجھے لوریاں دیتی تھی۔ آپ نے جن ...
خوابوں کا ذکر کیا ہے وہ میری روح کو تھوڑی دیر کے لئے بے حس کر دیتے تھے۔ لیکن
یہ کیفیت دیر تک قائم نہیں رہتی تھی۔ میری ہستی کا معمہ حل نہیں ہوتا تھا۔ اور میں ایک
بے لنگر اور بے بادبان کشتی کی طرح زندگی کی تیز و تند ہواؤں کے طوفان میں ادھر ادھر
تھپیڑے کھاتی پھرتی تھی۔ یہ تھا ناقابل برداشت بھاری بوجھ یہ زندگی نہیں تھی یہ زندہ
در گور ہونا تھا، یہ موت تھی۔ گویا ہماری سانس جاری ہو ہماری رگوں میں خون رواں ہو
لیکن ہم مردہ ہوں، ہماری روح مردہ ہو، اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہولناک نہیں۔ یہ چلتے
پھرتے ہوئے مردے، کتنے مکروہ، کتنے نجس، کتنے بدصورت ہیں۔"

وہ کرسی پر پھر آدھی لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں کمرے کے سیاہ پردوں پر جو قد آدم
کھڑکیوں پر پڑے ہوئے تھے، گڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

کمرے میں بالکل خاموشی چھا گئی، صرف آگ کے جلنے کی خشک سی سرسراہٹ اور
باہر سڑک پر چلتی ہوئی موٹروں کی دور دراز آواز۔

"کیا میں بھی چلتا پھرتا مردہ ہوں؟" نعیم نے یکبارگی خیال کیا اور اس کی ساری
روح سکڑ کر تھرا سی گئی جیسے اس نے غلطی سے بجلی کا تار چھو لیا ہو۔

"پھر آخر زندگی کے مبہم سوال کا آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اسے سنا، اسے محسوس کیا، اسے سمجھنے کی کوشش کی اور اسے معنی پہنانے
کی پیہم کوشش کر رہی ہوں۔"

"اور آپ کے نزدیک اس جدوجہد، اس روحانی اور جسمانی مشقت کے بعد زندگی
کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے؟"

"اس بوجھ کو ہلکا کرنا ہمارا مقصد ہی نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن ہم اس بیش بہا پتھر کو تراش کر اسے اور زیادہ قیمتی اور زیادہ قابل قدر اور زیادہ خوبصورت بنا سکتے ہیں۔"

"اس محنت کی اجرت؟ اس کا انعام؟"

"زندگی" لڑکی نے بہت دھیرے سے کہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سیاہ پردوں کو ہٹا کر اس نے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی۔ کہر بدستور چھایا ہوا تھا اور نیچے سڑک پر ادھر ادھر بجلی کی روشنی ٹمٹما رہی تھی اور روشنی کے حلقوں کے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

۴

دو شخص اندر نعیم کے کمرے میں داخل ہوئے ایک ہندوستانی لڑکی اور اس کے ساتھ ایک لڑکا، دونوں طالب علم۔

"آئیے ہارون صاحب" نعیم الدین نے کہا "مزاج اچھے ہیں۔ آپ دونوں تشریف لائے۔ مجھے بڑی خوشی ہے۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرا رقعہ آپ کو وقت سے نہ ملے اور آپ آ نہ سکیں۔" اور لڑکی کی طرف "کریمہ بیگم آپ آجکل کہاں رہتی ہیں؟ میں تو دو مہینے بعد آج آپ سے مل رہا ہوں۔ کوٹ اتار ڈالئے آپ دونوں۔ اور آئیے یہاں آگ کے قریب بیٹھئے۔ میں اس کوچ کو اور آگ کے پاس کھینچ دیتا ہوں۔ کیسا خراب موسم ہے اور آپ دونوں تو یہاں سے بہت دور رہتے ہیں۔ ایک ارلس کورٹ اور ایک گولڈرس گرین۔ آپ کا ساتھ کہاں ہو گیا؟" وہ بغیر اپنے مہمانوں کے جواب کا انتظار کئے ہوئے مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کمرے میں ادھر ادھر کرسیاں وغیرہ ٹھیک کرتا جاتا تھا۔ کتابیں، کاغذ، اخبار کمرے میں چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ کوچ اس نے صاف کی اور اسے آگ کے سامنے کھینچ لایا۔ ایک سگرٹ کی ناکرانی

اس کی کرسی کے پاس نیچے فرش پر رکھی ہوئی تھی، اس کو ٹھوکر لگی اور خاک تمام قالین پر بکھر گئی۔

دونوں نووارد دروازے سے دو تین قدم آگے بڑھ کر کچھ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ان کی نظر انگریز لڑکی پر پڑی جو ان کی طرف پیٹھ کئے ہوئے دو سیاہ پردوں کے درمیان، کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی باہر سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، کمرے کی دھندلی روشنی، نعیم کی گھبراہٹ اور اس کا ایک لڑکی کے ساتھ اکیلا ہونا۔ انھوں نے ان سب باتوں کو ملا کر اپنے ذہن میں ایک مکمل تصویر بنا لی اور ان کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نظر آئی۔

"معاف کیجئے گا۔ کہیں ہم لوگ وقت کے پہلے تو نہیں آگئے اور آپ کو زحمت دی؟" عارف نے کہا۔

"یہ قصور میرا ہے" کریمہ بیگم نے لچک کر کہا" میں نے عارف صاحب کو طالبعلموں کے ایسوسی ایشن میں دیکھا جہاں میں لکچر سننے گئی تھی لکچر وقت سے پہلے ختم ہو گیا تو میں نے عارف صاحب سے آپ کے یہاں آنے کے بارے میں ذکر کیا انھوں نے کہا کہ ان کا بھی بلاوا ہے بس ہم دونوں بغیر وقت دیکھے ہوئے چلے آئے؟" انھوں نے مسکراتے ہوئے انگریز لڑکی طرف دیکھا جو اب پلٹ کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

مگر نعیم ابھی تک کچھ ایسا گم سا تھا کہ اس نے ان دونوں کے اشاروں اور کنایوں کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔

"نہیں میرے خیال میں آپ ٹھیک وقت سے آئے ہیں۔ مجھے آپ کے آنے سے زحمت کیوں ہونے لگی؟" نعیم نے کچھ گھبرا کر پوچھا۔

انگریز لڑکی اب کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر آتشدان کی طرف آگئی عارف اور کریمہ بھی قریب آکر بیٹھ گئے اور ان تینوں نے ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ نعیم

نے عارف اور کریمہ کے کوٹ لے جا کر کونے میں کھونٹی پر ٹانگ دیئے۔
پھر اس نے واپس آکر سب کو سگریٹ پیش کیئے۔
"جی نہیں، شکریہ، میں سگریٹ نہیں پیتی" کٹھ پتلیوں کی سی مہین آواز میں کریمہ نے کہا۔
نعیم الدین نے زور سے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ اسے کچھ سکون ہونے لگا۔ اس کی حالت اس درخت کی سی تھی جو تیز آندھی میں جڑ تک ہل گیا ہو۔ اب رفتہ رفتہ وہ اپنی معمولی حالت پر پہنچ رہا تھا۔
میں نے آپ لوگوں کا ان خاتون سے تعارف نہیں کرایا معاف کیجئے گا۔ یہ مسٹر عارف ہیں" اس نے عارف کی طرف جھک کر کہا۔ اور یہ مس" وہ رک گیا اور انگریز لڑکی کی طرف مسکرا کر اس نے دیکھا" مجھے آپ کا نام ابھی تک معلوم نہیں!"
لڑکی مسکرائی اس نے عارف سے ہاتھ ملا کر کہا" میرا نام شیلا ہے شیلا گرین"
وہ کریمہ کی طرف بھی مڑی اور اس سے اسی طرح اس نے اپنا تعارف کیا۔
"نعیم صاحب روشنی اور نہیں ہو سکتی؟ اس اندھیرے میں تو صورت بھی اچھی طرح نہیں دکھائی دیتی" عارف نے اپنے پتلون کی کریز ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں ضرور" اور یہ کہہ کر نعیم نے کمرے کے بیچ میں چھت سے جو لمپ لٹکا ہوا تھا جلا دیا چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔
عارف پورا جنٹلمین معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سوٹ آٹھ دس گنی کا ہوگا اور اس کی صورت سے یہ ٹپکتا تھا کہ اسے اس بات کا احساس بھی ہے۔ وہ شیلا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اس لئے کہ اس خوبصورت لڑکی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے۔
"کیا خیال ہے آپ کا اس موسم کے بارے میں؟" اس نے بالکل انگریزی لہجہ میں بولنے کی کوشش کرتے ہوئے شیلا سے کہا۔

"احمق!" نعیم الدین نے اپنے دل میں خیال کیا "اسے سوائے موسم کی باتیں کرنے کے اور کچھ نہیں آتا" اسے کچھ جھنجھلاہٹ سی معلوم ہوئی۔ اسے عارف کی مسکراہٹ پر غصہ آیا۔ "یہ کیا سمجھتا ہے؟ اپنے آپ کو شاید بہت حسین خیال کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کی ایک نظر میں ایسا جادو ہے کہ جس عورت کو جی چاہے وہ اپنا غلام بنا سکتا ہے"

"میرا موسم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ سچ پوچھیے تو میں اس مضمون پر زیادہ خیال ہی نہیں کرتی" شیلا نے جیسے خواب سے چونک کر کہا۔ پھر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ شاید اس کے اس جواب سے روکھا پن ظاہر ہوا ہو۔ اس نے اس کے اثر کو مٹانے کی کوشش کی۔

"میں تو اسی موسم میں پیدا ہوئی اسی میں اتنی بڑی ہوئی اس وجہ سے میرے اوپر آج کے ایسے برے موسم کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آپ لوگ جو مشرقی دھوپ کے عادی ہیں ضرور ہمارے تاریک انگریزی موسم کو گالیاں دیتے ہوں گے"

عارف کو ایسا جواب ملنے کی امید نہیں تھی اس نے محسوس کیا کہ اس کا پہلا وار ناکامیاب رہا۔ اسے چند لمحوں تک سوچنے کی ضرورت پڑی "اب کیا کہنا چاہیے؟" اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

"تاریک موسم! بالکل ٹھیک کہا آپ نے کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ دن کو بھی کمرے میں روشنی جلانا ہوتی ہے" کریمہ بیگم نے اپنی گلابی بنارسی ساری کا آنچل ٹھیک کیا اور چڑیا کی طرح چوں چوں کرنے لگیں "خیال تو کیجیے کل بارہ بجے دن کو مجھے اپنے کمرے میں کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اور اخباروں میں آپ نے دیکھا کیا خبر تھی؟ ہیمپسٹڈ کے پاس ایک عورت کے ہاتھ سے دن دہاڑے کسی نے ہینڈ بیگ چھین لیا۔۔ بھاگ گیا۔ پولیس سے کچھ بنائے نہ بنی۔ یہ تو ہم میں نے سنا ہے کہ آجکل وہاں خون تک ہو جاتے ہیں' اندھیرے میں چھوکرے اکیلی عورتوں پر حملہ کرتے ہیں اور انکی ناشپاتی پیڑوں کے نیچے چھپا کر چمپت ہو جاتے

ہیں. گذشتہ سال سنا ہے وہاں ایک لڑکی کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کی ہوئی پائی گئی۔ اسوا اس کے سر کے جو چھ مہینے بعد ایک بکس میں بند برائٹن کے اسٹیشن میں ملا۔ اور یہاں کی پولس کو سنتے تھے بڑی چالاک ہے. کیا چالاکی اس نے دکھائی ؟ ابھی تک قاتل کا پتہ نہیں چلا. میں تو ہمپسٹڈ شام کے وقت کبھی اکیلی نہیں جاتی۔ کیا معلوم...." ہیا ہیا ہیا ایک خشک سی ہنسی وہ ہنسیں۔

نعیم کو گھبراہٹ پھر شروع ہوئی۔ اس کی باتیں سن کر شیلا اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی. چرچر چر بولتی چلی جاتی ہے کمبخت مہمل خرافات"

لیکن مس کریمہ" اس نے شرارت سے کہا " ہمپسٹڈ میں نوجوان عورتوں پر حملہ کی وجہ ہمیشہ چوری کرنا ہی نہیں ہوتی " نعیم کو یقین تھا کہ اب کریمہ ضرور اس مضمون پر گفتگو کا سلسلہ ختم کر دے گی. لیکن اسے مایوسی ہوئی۔

"پھر آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے ؟" بیگم صاحبہ نے ایک بچے کے بھولے پن سے پوچھا۔

" نعیم ذرا جھجکا. پھر اس نے بڑی متانت کی کوشش کرتے ہوئے گہری آواز میں جواب دیا۔

"ایک مرد عورت پر اس کے زروجواہر کے لئے حملہ کر کے اپنی زندگی کبھی خطرے میں نہیں ڈالتا. عورت کی دولت اس کے روپیہ پیسے نہیں، عورت کی دولت اسکی جوانی ہے عورت کی دولت اس کا حسن ہے۔ اور جو بھوکا پیاسا مرد ان قیمتی چیزوں کو جو ہماری موجودہ سوسائٹی میں اس قدر بیکار ضائع ہوتی ہیں۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر لوٹنے کی کوشش کرتا ہے اس کے لئے قانون اپنی زنجیریں تیار کرے تو کرے، لیکن کسی اہل دل کی انگشت ملامت تو اس کی طرف ہرگز نہیں اٹھنی چاہیئے۔ میرے خیال میں جو لوگ ہمپسٹڈ میں نوجوان عورتوں پر حملہ کرتے ہیں ہمارے دل میں ان کی عزت ہونی چاہیئے۔

کریمہ بیگم کا چہرہ شرم کی وجہ سے سُرخ ہو گیا اور ان کی آنکھیں نیچی ہو گئیں"

معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی اپنی عصمت پر کسی بدمعاش نے حملہ کیا۔

عارف نے محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی، اس نے چھت کی طرف دیکھ کر سگریٹ پینا شروع کر دیا۔

نعیم کی نظر شیلا پر پڑی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس سے شیلا یہ سمجھ گئی کہ یہ باتیں صرف شرارت کے لئے کر رہا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس بے موقع اور غیر مہذب تقریر سے جو بے لطفی پیدا ہو گئی تھی اس کی تلخی کا احساس میاں عارف کو سب سے زیادہ تھا۔

"نعیم صاحب گراموفون بجایئے۔ آپ نے مورس شولیئے[1] کی تازہ ترین فلم دیکھی؟ اس نے اس فلم میں لاجواب گانا گایا ہے آپ کے پاس اس کا ریکارڈ تو ضرور ہوگا۔ میں نے گذشتہ ہفتہ چند ریکارڈ خریدے اس میں وہ بھی تھا" اور پھر شیلا کی طرف مڑ کر انھوں نے پوچھا "آپ کو مورس شولیئے پسند ہے؟"

"شروع شروع میں اسی کی فلموں سے مجھے کافی دلچسپی تھی۔ اس میں ایک تازگی، ایک فرانسیسی لوچ تھا۔ لیکن اب اس کے گانے اور اس کی فلم دونوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اچھے اور برے آرٹسٹ کی پہچان یہ ہے کہ اچھے آرٹسٹ سے کبھی جی نہیں بھرتا۔ جب اسے دیکھو تو ہر مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں نئے روحانی تحفے پیش کرتا ہے معمولی آرٹسٹ کا خزانہ بہت جلد خالی ہو جاتا ہے اور ہم اس کے پاس سے اکثر خالی ہاتھ واپس آتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" شیلا نے عارف سے پوچھا۔ بیچارے عارف اس سوال سے کچھ سٹ پٹا گیا "آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں مورس شولیئے کچھ اعلیٰ قسم کا ایکٹر نہیں۔ میں بھی اس سے عاجز ہو چلا ہوں۔ آپ کا کہنا بالکل بجا ہے اس کا خزانہ اب خالی ہو گیا۔" اور یہ کہہ کر وہ ہنسا۔

---

[1] ایک مشہور فرانسیسی ایکٹر ۱۲

"خوشامدی" نسیم نے اپنے دل میں سوچا "ابھی ابھی تو موسیٰ شوالئے کی تعریف کر رہا تھا۔ اور اب بے سوچے سمجھے اسکی برائی کرنے لگا۔ اور اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟
مگر شیلا نے ان باتوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس نے عارف سے پوچھا "آپ کے یہاں ہندستان میں آرٹ کا کیا حال ہے؟ مجھے یقین ہے کہ ہندستانی جو اتنے خوبصورت ہوتے ہیں ضرور بہت اچھے آرٹسٹ بھی ہوں گے۔"

اب تو عارف اور گھبرایا۔ آئی، سی، ایس کے امتحان کی تیاری میں لگے رہنے کی وجہ سے اسے اس کی بالکل فرصت نہیں ملی تھی کہ وہ فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ کرے۔ دو برس سے وہ کولھو کے بیل کی طرح اس مشکل امتحان کی تیاری میں مشغول تھا، آٹھ نو گھنٹہ روزانہ باقاعدہ وہ کام کرتا تھا۔ پھر بھلا اپنے دماغ کی تربیت کے لئے اس کو وقت کہاں سے ملتا۔ ہندوستان میں اس کا یہی حال تھا۔ اس کے خاندان والوں نے اس کے بچپن ہی سے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر آئی، سی، ایس میں شامل ہوگا۔ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اس کے کان میں یہی بات پڑتی تھی کہ وہ آئی، سی، ایس کے عہدہ پر پہونچنے والا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کو اور اس کے رشتہ داروں کو اس بات کا یقین ہونے لگا کہ وہ ضرور اس مشکل امتحان میں کامیاب ہوگا۔ وہ سمجھنے لگے کہ یہ ان کے خاندان کا اور عارف کا پیدائشی حق ہے۔ ایک ہندستانی شریف خاندان کے نوجوان کا اس سے بڑھ کر اور کیا حوصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ مجسٹریٹی اور کلکٹری کے شاندار عہدہ تک پہنچ کر ہندستان کے حاکموں میں شمار کیا جانے لگے۔ عارف نے بی، اے پاس کرنے کے بعد ہندستان میں آئی، سی، ایس کا امتحان دیا مگر وہ اس میں ناکامیاب رہا۔ اس ناکامیابی کی وجہ عارف اور اس کے خاندان والوں کے نزدیک یہ تھی کہ ایک ہندو ممتحن نے اسے مسلمان ہونیکی وجہ سے نمبر کم دیئے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ عارف اور آئی، سی، ایس کے امتحان میں پاس نہ ہو! ہندستان میں فیل ہو چکنے کے بعد عارف کے والد نے یہ طے کیا کہ انگلستان میں پاس ہونے کی امید زیادہ ہے

اب عارف ولایت بھیجا گیا۔ ولایت پہنچ کر اس نے پوری دیانتداری سے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ شاید ہی کبھی وہ سینما یا تھیٹر میں جاتا ہو۔ دوسرے ہندوستانی طالب علم لڑکیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے، ناچ گھروں میں جاتے، کھیل کود میں وقت گنواتے، یا پالٹیکس میں حصہ لیتے، مگر عارف لیلائے سیول سروس کا مجنوں تھا۔ خچر کی طرح وہ بھی ایک سیدھے راستہ پر لگا ہوا کام کرتا چلا جاتا، اسی کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی سما گئی تھی کہ انگریزی کپڑے اچھی طرح پہننا، انگریزی زبان انگریزی لہجہ میں بولنا، سینما کی تصویروں کے بارے میں اور ہولی وڈ کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے سوانحی معاملات، ان کی شادیوں اور طلاقوں کی تازہ ترین خبروں سے واقف رہنا اور ان پر بات چیت کرنا، کلکٹری کے امیدوار کا فرض ہے۔ وہ ان لوگوں کا جانشین ہونے والا تھا جن کو اس بات پر فخر تھا کہ انھیں اپنی مادری زبان اچھی طرح بولنی نہیں آتی۔ اور جو اپنے کو انگریزوں سے بھی بڑھ کر "پکا صاحب" سمجھتے تھے۔ انھیں "پکے صاحب لوگوں" میں ایک "مسلمان" کلکٹر صاحب تھے جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے بقرعید کے دن اپنے مسلمان منشی سے پوچھا "ویل منشی! کیا آج تم لوگوں کا بڑا دن ہے؟" یہ حالت ایک نسل پہلے تھی لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ ان "پکے صاحبوں کے وارثوں میں" صاحبیت "کم ہو گئی۔ اور انسانیت آ گئی۔

"آپ کے خیال میں ہم ہندستانی عام طور پر خوبصورت ہوتے ہیں؟" عارف نے اُلٹے شیلا سے اس سوال کو پوچھ کر ہندستانی آرٹ کے متعلق گفتگو سے ٹال دینے کی کوشش کی۔ "ہم ہندستانی" اس نے اس لہجہ سے کہا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے کو سارے ہندستانیوں کے حُسن کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے۔

شیلا نے جواب دیا "جی ہاں۔ میرے نزدیک ہندستانی ہم انگریزوں سے زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے میرا خیال غلط ہو کیونکہ میں نے صرف گنتی کے ہندستانی

یورپ میں دیکھے ہیں۔"

کریمہ بیگم نے جو نعیم کی گستاخانہ باتیں سن کر سکڑ کر رہ گئی تھیں پھر اپنے پر پھڑ پھڑانے کی کوشش کی۔

"کیا آپ لندن میں بہت سے ہندستانیوں سے واقف ہیں؟" انھوں نے شیلا سے مسکرا کر پوچھا۔

"بدتمیز" نعیم نے خیال کیا "یہ عورت کوئی بات بھی ٹھکانے کی نہیں کرتی! سوال کرتے وقت مسکراتی تو ہے۔ اس طرح سے جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں مگر دل میں زہر بھرا ہوا ہے! اس سے کیا مطلب کہ شیلا کتنے ہندستانیوں کو جانتی ہے۔ خود تو یہ حالت ہوگی کہ مرد کا خیال کرنے سے بیگم صاحب کے جسم میں جھر جھری آجاتی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ مرد ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔"

"معلوم نہیں بہت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔" شیلا نے جواب دیا پھر وہ ذرا دیر رکی اور ہنس کر کہا: "اور واقف ہونے کے بھی مختلف معنی ہو سکتے ہیں لیکن اس وقت تو ہندستانیوں کی صورت شکل سے بحث ہے اور اس کے لئے اُن سے "واقف ہونا" ضروری نہیں۔"

"خوب جواب دیا" نعیم نے سوچا "ایسے ناشائستہ سوال کا اسی طرح منہ توڑ جواب دینا چاہیئے۔"

شیلا نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا "مجھے ہندستان اور ہندوستان کی ہر چیز سے بہت دلچسپی ہے۔ میرے ایک چچا ہندستان میں نوکر تھے۔ مجھے یاد ہے جب وہ چھٹیوں میں گھر واپس آتے تو وہ میرے لئے ہندستانی کھلونے لایا کرتے تھے۔ عجیب و غریب کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں، رنگ برنگ کے چمکدار کپڑے پہنے ہوئے ان کے تاگے سے بنے ہوئے کالے بال، ان کی لمبی لمبی چوٹیاں، ان کے چھوٹے چھوٹے منہ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور بھویں، انھیں دیکھ کر میں بچپن میں ہندستان کو ایک پرستان سمجھتی تھی جہاں خوبصورت

شہزادے اور حسین سانولی عورتیں زر و جواہر میں لدے ہوئے سنگِ مرمر کے بڑے بڑے
محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب میں بڑی ہوئی اور میں نے اسکول
جانا شروع کیا اور وہاں میں نے تاریخ پڑھی تو میرے بچپن کے تصورات رفتہ رفتہ بدلنے
لگے۔ سراج الدولہ اور "بلیک ہول" کے ہولناک قصے پڑھ پڑھ کر اور ہندستانیوں اور
"کالے آدمیوں" کی برائیاں سُن سُن کر میرے دل میں ہر سیاہ فام انسان کی طرف سے
کچھ خوف سا بیٹھ گیا۔ باوجود اس کے وہ دلچسپی جو مجھے اس دور دراز "نامعلوم ملک"
بچپن ہی سے تھی غائب نہیں ہوئی۔ جب میں کالج میں داخل ہوئی تو میں نے ہندستانی
طالبعلموں سے ملنے کی خاص طور پر کوشش کی، گو کہ میرے والدین ہمیشہ مجھ سے تاکید کیا
کرتے تھے کہ "کالے لوگوں" سے بچتی رہوں۔ بدقسمتی سے میری اس خاص کوشش کا بہت
مایوس کن نتیجہ نکلا۔ لوگوں کو میری طرف سے طرح طرح کی غلط فہمیاں ہونے لگیں۔ اب مجھے
ان باتوں کا خیال کر کے ہنسی آتی ہے میں اس زمانہ میں کتنی ناتجربہ کاری اور حماقت
کی حرکتیں کیا کرتی تھی!" شیلا چپ ہو گئی۔ اس کے لبوں پر تبسم کا شائبہ تھا معلوم ہوتا تھا
کہ وہ اپنے زندگی کے گذرے ہوئے دنوں پر ترس بھری نظریں ڈال رہی ہے۔ کریمہ
کو اس انگریز لڑکی پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اتنی دیر سے وہی ساری گفتگو اور تمام دلچسپی کا
مرکز بنی ہوئی تھی۔ نعیم اور عارف دونوں ہر بات اسی کمبخت انگریزن کو خوش کرنے کے لئے
کرتے۔ عارف کلب سے اس کے ساتھ یہاں آیا۔ لیکن اس لڑکی کو دیکھتے ہی اس نے
کریمہ کا وجود تک بھلا دیا۔ برابر اس کی طرف رخ کرنا، اس کو دیکھ کر مسکرانا اور ہمیشہ
خطمی ہونا، اس پر اثر ڈالنے کی کوشش کرنا، اور بار بار تن تن کر صرف اس لئے کہ وہ ان
کے بڑھیا سوٹ اور بانکے جسم کی طرف توجہ کرے، کریمہ کے دل میں یہ حرکتیں کانٹے کی طرح
چبھ رہی تھیں۔ انھیں نعیم الدین پر اور تعجب آ رہا تھا، وہ کتنا خاموش، نیک، خوش سلیقہ
انسان تھا اور آج اس سے ایک بھی سیدھی بات نہیں ہوتی۔ کریمہ کی ہر بات کا وہ ٹیڑھا

جواب دیتا۔ اس کے ساتھ بدتمیزی سے بتاؤ کرتا اور شیلا کی طرف وزدیدہ نگاہیں اور تبسم
ان ہندستانی لڑکوں کو آخر کیا ہو گیا؟ گورا چمڑا دیکھ کر انھیں اپنے اوپر بالکل قابو نہیں
رہتا۔ سوا سفید چمڑے کے اور اس فرنگن میں کیا ہے؟ کیا بن بن کر باتیں کرتی ہے۔
دیدہ دلیری سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چست کپڑے صرف اس لئے پہنتے ہیں کہ
مرد اس کے جسم کی بہار دیکھیں، بے شرم، بے غیرت، بے حیا ایسی عورتوں میں اور
زنانِ بازاری میں کیا فرق؟ چڑیلوں کی طرح بال بکھیرے ہوئے، منہ پہ پاوڈر لگا ہوا
لہنگے میں سے گز گز بھر ٹانگیں باہر نکلیں، جرابیں ریشمی، اتنی باریک کہ ان کا ہونا نہ ہونا
برابر۔ کھڑی ہوں تو اکڑ کر، چلیں تو سینہ تان کر، سگرٹ پہ پئیں، شراب پہ پئیں، ناچیں
یہ کون سے ہنر ہیں جو ان فرنگیوں میں نہیں، رہ گئی عصمت، آبرو، اسے تو یہ ہتھیلی پہ لئے
پھرتی ہیں۔ آج اس مرد پہ ڈورا ڈالا تو کل دوسرے کو پھانسنے کی فکر۔ سوائے مزے اڑانے
کے ان کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں اور ہمارے ہندوستانی لڑکے ولایت آ کر ان کے
جال میں ایسا پھنستے ہیں کہ ان کو دنیا و ما فیہا کی خبر نہیں رہتی۔ آخر ان کی سمجھ پر کیوں پتھر
پڑ گئے؟ کوئی مجھے بتائیے کہ اس شیلا گرین میں کہاں کا حسن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جو
یہ دونوں اس پر مرے جاتے ہیں۔ بڑی آئی ہے ہندوستان کی دوست بننے والی! صرف
ان لڑکوں کی خوشامد کے لئے کہتی ہے کہ ہمیشہ سے اسے ہندستان سے دلچسپی ہے!
شرابی، سور خور کرسٹان، ہمیں اس دوستی کی حقیقت خوب معلوم ہے۔ کہتی ہے کہ
ہندستانی بڑے خوبصورت ہوتے ہیں جس میں ان لڑکوں کے سر پھر جائیں! اور چالاکی
تو دیکھو کیسا میرے سوال کو پی گئی۔ جواب دیتی تو قلعی نہ کھل جاتی۔ معلوم نہیں کتنے ہندستانیوں
کو خراب کر چکی ہو گی۔ چلتر باز! لیکن آخر ان لڑکوں کی عقل پر کیوں پردے پڑ گئے ہیں؟
بہت پڑھی لکھی بھی تو نہیں معلوم ہوتی۔ سینہ سپاٹ، پھیکا رنگ، صورت پہ پھٹکار
برستی ہے۔ جسم مردوں کا ایسا، یہ عورت ہے یا پہلوان! ایک بھی بات، تو اس میں

شریف زادوں کی سی نہیں۔ پنچ خاندان کی ہوگی۔ کسی مزدور یا اٹھائی گیرے کی لڑکی۔ اگر
اسے پوچھتے نہ ہوں گے" ایسی ایسی کتنی لڑکیوں کو یہاں شوہر نہیں دستیاب ہوتے، تو
سب جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں، چلتی ہوئی عورت ہے، کسی بھولے بھالے امیر ہندوستانی
شریف زادے کو پھانس کر اس سے شادی کرنے کی فکر میں ہوگی۔ دل میں ضرور ہم لوگوں
سے نفرت کرتی ہوگی۔ لیکن اپنے کو دولت کے لئے بیچ دے گی۔

کریمہ بیگم طیش اور غصہ سے کھولنے لگیں۔ ان کا دل یہ چاہ رہا تھا کہ شیلا گرین کے
بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر نوچیں اور اسے دھکا مار کر اس کمرے سے باہر نکال دیں۔
وہ اسوقت اپنے آپکو تمام ہندستانی نسل کی عزت اور آبرو کی واحد امین سمجھ رہی تھیں۔

عارف کو بھی شیلا کی طرف سے مایوسی ہونے لگی، اس نے بار بار اس سنہرے
بالوں والی پری زاد پر اثر ڈالنے کی کوشش کی، لیکن اس لڑکی نے اس کی طرف کوئی
خاص توجہ نہیں کی "عجیب لڑکی معلوم ہوتی ہے"!

عارف نے خیال کیا "زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتی۔ کبھی آرٹ کی بات کرتی
ہے تو کبھی ہندستانیوں کے حسن کی۔ اس کے نزدیک میرا اس کمرے میں ہونا نہ ہونا برابر
ہے۔ مغرور ہے۔ اپنے کو بہت قابل سمجھتی ہے۔ ضرور یونیورسٹی میں طالب علم ہوگی۔ جو
لڑکیاں یونیورسٹی تک پہونچ جاتی ہیں وہ خود کو بڑا علامہ دہر سمجھنے لگتی ہیں" لیکن اس
نے شکست قبول کرنے سے انکار کیا۔ وہ جو آئی، سی، ایس کا امتحان پاس کر کے
ہندستان میں سینکڑوں ہزاروں انسانوں پر حکومت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، وہ جس
کی ایک نظر خشمگیں سے غریب ہندستانیوں کے دل لرز جائیں گے، (عارف ابھی سے
اس حاکمانہ طاقت کی شراب کے مزے لینے لگا تھا) وہ ایک معمولی انگریز کی لڑکی کے
ہاتھوں ہرگز ہار نہیں مانے گا۔ "ابھی اس کو یہ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ ہندستانیوں
کی خوبصورتی کا ذکر آخر کیوں کیا۔ عارف کو اپنے سارے کارنامے یاد آنے لگے۔ کیا وہ

ہندستان میں ہمیشہ محنتی اور ذہین نہیں مشہور تھا؟ یہ سچ ہے کہ ہندو لڑکے ہمیشہ امتحان میں اس سے بازی لے جاتے تھے لیکن یہ غالباً ہندو پروفیسروں کے تعصب کی وجہ سے تھا جو ہندوؤں کو اوّل کرنے کے لئے ہمیشہ اسے نمبر کم دیتے۔ مسلمانوں میں ہمیشہ وہی فرسٹ رہتا تھا۔ اور پھر مسلمان ہندوؤں کی طرح چوٹی چھت پر باندھ کر ساری رات بھر پڑھتے بھی تو نہیں۔ ان کی طبیعت میں حکومت ہے۔ حکومت، اچھی طرح سے حکومت کرنے کے لئے امتحان میں اوّل آنا ضروری نہیں"! عارف کو افسوس ہوا کہ اس انتخاب آئی۔ سی۔ ایس میں براہ راست نامزدگی سے کیوں نہیں ہو گیا حق اسی کا تھا مگر چونکہ دوسرے مسلمان امیدوار کے خاندان کا گورنمنٹ کی نظروں میں رتبہ زیادہ تھا۔ اس لئے دوسرا آدمی اس کی جگہ منتخب ہو گیا۔ اگر آج وہ آئی۔ سی۔ ایس' میں ہوتا تو نعیم کو ضرور "مسٹر عارف۔ آئی۔ سی۔ ایس" کہہ کر شیلا سے اس کا تعارف کرانا پڑتا خیر اب نہیں تو ایک سال بعد سہی۔ اس نے اپنے دانت دبا کر بند کر لئے۔ اس نے پکا منصوبہ باندھا کہ وہ ایک گھنٹہ روزانہ اور زیادہ کام کرے گا۔ اور جس طرح وہ گھنٹوں کی محنت کے بعد کتابوں کے صفحے کے صفحے زبانی رٹ لینے میں کامیاب ہوتا تھا اسی طرح اس وقت اس نے پورا تہیہ کر لیا کہ شیلا گرین پر وہ اپنا اثر ڈال کر رہے گا

عارف نے کہا "مس گرین، مجھے امید ہے کہ آپ نے اپنے تلخ تجربوں کی وجہ سے ہندستان سے اپنی دلچسپی کم نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہندستانی طالب علم جو یورپ آتے ہیں اکثر اپنے غیر مہذب ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کو یہاں کی شریف خواتین سے ٹھیک طرح سے بات چیت کرنے اور ملنے جلنے کا طریقہ بالکل نہیں آتا۔

شیلا ہنسنے لگی اور اس نے کہا "میرے تلخ تجربے! مہربانی فرما کر ان کو اتنی زیادہ اہمیت نہ دیجئے۔ ہر تجربہ کار لڑکی کے لئے یہ تجربہ ضروری ہیں بغیر ان کے عورتوں کو سمجھ نہیں آتی۔ میرے کہنے کا بالکل یہ مطلب نہیں تھا کہ میں ہندستانی طالب علموں

کو غیر مہذب سمجھتی ہوں برخلاف اس کے جیسا میں نے کہا اس معاملہ میں میرا اپنا قصور تھا۔ اور برلئے خدا! آپ میرا شمار شریف خواتین، لیڈیوں میں نہ کیجئے؟ اس نے بڑی لجاجت سے نعیم کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کیا دراصل میری صورت اتنی گری ہوئی ہے کہ آپ مجھے ایک "شریف خاتون" سمجھیں؟ مجھے امید ہے کہ کم از کم آپ تو مجھے اتنی گئی گذری نہ خیال کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑ کر آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور اپنے اوپر سر سے پیر تک نظر ڈالی "نہیں ہرگز نہیں! مجھ میں کوئی بات شریف زادیوں کی ایسی نہیں، میرے چہرہ میں کون سی بناوٹ ہے؟ کیا میری آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں اور میرے ہاتھ، دیکھئے میرے ہاتھ ایسے تو نہیں جن کو دیکھ کسی کو یہ شبہ ہو سکے کہ یہ کسی بیکار رانی کے ہاتھ ہیں۔ اور جب میں بولتی ہوں تو کیا ہر وقت خرافات بکتی ہوں۔ کبھی کبھی ضرور لیکن ہر وقت نہیں۔ اور میری آواز ایسی تو نہیں جسے سن کر کوئی یہ سمجھے کہ مینا بول رہی ہے۔ میں بدصورت سہی، بدشکل سہی، مگر میں دھوکہ تو نہیں، جھوٹ تو نہیں۔" اس کے چہرے پر بچوں کی سی متانت آ گئی۔

نعیم زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ اور شیلا کو چڑھانے کے لئے اس نے کہا "مس گرین آپ لاکھ کوشش کریں مگر شرافت کا دھبہ آپ کے دامن سے نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ تو پیدائشی چیز ہے۔ آپ کے سر پر شرافت کا بوجھ جو خود خدا نے اپنی امانت سمجھ کر لادا ہے، اور آپ اس قیمتی خزانہ کو لٹا دینا چاہتی ہیں، یہ ناممکن ہے۔ اس کی کوشش ہی فضول ہے!"

شیلا بھی ہنسنے لگی۔

عارف کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے، اسے ایک بارگی اپنی پستی کا احساس ہونا شروع ہوا۔ "آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی مرتبہ کوشش کرنے کے بعد بھی اس نے ابھی تک ایک بات بھی ایسی نہیں کی جسے یہ لڑکی پسند کرے! اور نعیم بغیر زیادہ بولے ہوئے کتنی

کتنی اچھی طرح اس لڑکی پر اثر ڈال رہا ہے نعیم نہ تو میری طرح خوبصورت ہے اور نہ اس کے کپڑے ہی اچھے ہیں۔ مجھے کامیابی کیوں نہیں ہوتی ؟" وہ اسی فکر میں ڈوب گیا اور نعیم اور شیلا کو زور زور سے ہنستا دیکھ کر خود بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

کریمہ بیگم شیلا کو اس طرح ہنستا بولتا دیکھ کر جل بھن کر کباب ہوئی جا رہی تھیں۔"

۵

تھوڑی دیر بعد نعیم کے کمرے میں دس پندرہ آدمی جمع ہو گئے۔ پانچ چھ لڑکیاں، اور آٹھ دس لڑکے۔ گراموفون بجنے لگا۔ میز اور کرسیاں لوگوں نے کھسکا کر کنارے رکھ دیں اور ناچ شروع ہو گیا۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا، کوئی صرف لمنیڈ یا شربت پی رہا تھا، کسی نے صرف سگرٹ پر قناعت کی تھی۔ ہر تین چار منٹ کے بعد ایک ریکارڈ ختم ہو جانے پر باجہ بجنا رک جاتا، تو شور و غل میں ذرا کمی ہو جاتی، ناچنے والے جوڑے ایک دوسرے سے جدا ہو کر منتشر ہو جاتے، کوئی بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس جا کر ان کی گفتگو میں شامل ہو جاتا، کوئی کھڑا رہ جاتا اور بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتا۔ کوئی کسی لڑکی کو الگ گوشے میں لے جا کر اس سے راز و نیاز کی باتیں کرتا۔ ایک دو آدمی جو شراب زیادہ پی گئے تھے، چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔

اختر ایک کونے میں اکیلا چپ بیٹھا تھا۔ اس کی دوست جبین کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔ اس [illegible] شور، ناچ اور لوگوں کی ہنسی سے اسے تکلیف ہو رہی تھی اور [illegible] اتنا زیادہ دبا رہا تھا کہ وہ خود کو اس محفل میں [illegible] کر رہا تھا۔ جیسے بننے

چشمے میں ایک بھاری پتھر۔

راڈجو شیلا کے ساتھ ناچ کر ابھی ابھی رکا تھا۔ نعیم کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شیلا بھی وہیں آ گئی، وہ شیلا کا مذاق اڑا رہا تھا۔

نعیم! اس سنہرے بالوں والی اینگلو سیکسن لڑکی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اتنی دیر جو یہ تمہارے ساتھ اکیلی رہی تو ضرور اس نے تم پر رعب جمانے کی کوشش کی ہوگی اور تم سیدھے سادے آدمی رعب میں آ گئے ہوگے۔ لیکن میں ان صاحبزادی کی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ فلسفہ، پالٹیکس، ہندوستان، وید، گاندھی، ٹیگور ہر چیز پر آپ رائے زنی کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارا بھی سر کھا گئی ہوں گی۔"

"برخلاف اس کے!" نعیم نے جواب دیا "مس گرین سے مل کر اور ان کی باتیں سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ہم زندگی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ زندگی کے بارے میں مس گرین کے خیالات، نہایت دلچسپ اور قابل غور ہیں۔

راڈ قہقہہ مار کر ہنسا "زندگی! اور اس پر بحث! اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے کو کس قدر اہم، کس قدر عظیم الشان ہستی خیال کرتا ہے۔ لیکن نظام کائنات میں ہمارا کیا درجہ ہے؟ زمین پر رینگنے والے کیڑوں میں سے ذلیل ترین کیڑے۔ اور ہم اپنی زندگی کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کائنات کے مرکز ہیں! یہ کتنی مضحک بات ہے!!

کریمہ بیگم بھی ایک طرف بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔

"لیکن بیگم صاحب" ان سے گفتگو کرنے والا لڑکا کہہ رہا تھا "آپ کی کوشش بالکل بیکار ہے۔ آپ بھی یہ کہتی ہیں کہ ہمیں یورپ سے صرف یہاں کی اچھائیاں سیکھنا چاہیئے برائیاں نہیں۔ اور آپ ہمارے سامنے ایک ایسا نصب العین پیش کرتی ہیں جس میں ہندوستانی اپنی سب برائیاں چھوڑ کر اپنی اچھائیاں اور یورپ کی اچھائیاں ملا کر دنیا کی بہترین مخلوق

بن جائیں۔ آپ کی اس بات پر دو اعتراض کئے جا سکتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ ایک سوسائٹی میں اچھائیاں اور برائیاں انسانوں کی ذاتی رائے اور ذاتی پسند کی وجہ سے نہیں رائج ہوتیں۔ آپ یورپ کی بہت سی باتوں کو برا سمجھتی ہیں۔ مثلاً آپ کہتی ہیں کہ یہاں کی عورتوں کا آزادی کا معیار انھیں برے راستے پر لے جاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ رسم اور رواج کیوں وجود میں آئے، یورپین زندگی میں نئے معیار کیوں قائم ہوئے۔ پانچ سو برس پہلے یہاں کی عورتوں کا قریب قریب وہی درجہ تھا جو ہندستان میں آجکل ہے۔ لیکن اس درمیان میں یورپ کے معاشی نظام میں زبردست انقلاب ہو گیا جس کا اثر یہاں کے سماجی اور سیاسی نظام پر پڑا۔ اس وجہ سے یورپین ذہنیت میں بھی انقلاب واقع ہوا۔ یہاں کے رسم اور رواج سب بدل گئے۔ آج کل کا یورپین انسان ان تمام تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کی اچھائیوں اور اس کی برائیوں کی جڑ اس کے سماجی نظام میں ہے۔ ہندستان میں بھی بڑی بڑی بنیادی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جو آپ یورپ کا ضرورت سے زیادہ اثر کہتی ہیں وہ انھیں تبدیلیوں کی وجہ سے بڑھ رہا ہے۔ ان میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی، صرف ان کو دیکھنا اور ان کی جڑ پر نظر نہ ڈالنا حماقت ہے اور دوسرا اعتراض ..... "

ان دونوں کے ادھر ادھر ایک دو لڑکے لڑکیاں اور آکر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے بات کاٹ کر کہا "دوسرا اعتراض جناب احسان صاحب پر میرا یہ ہے کہ انھیں کوئی حق یہاں اسپیچ دینے کا نہیں۔ ہم لوگ پارٹی میں شریک ہونے آئے ہیں لکچر سننے نہیں۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ احسان اور کریمہ بیگم فوراً کھڑے ہو کر ساتھ ناچیں۔"

اس بحث کا مرکز بن جانے کی وجہ سے کریمہ بیگم کے دل کو ذرا سکون ہوا۔ تین چار لڑکوں نے اصرار کرنا شروع کیا کہ وہ احسان کے ساتھ ناچیں۔ احسان بھی ہنس کر کھڑا ہو گیا۔ "ضرور میں تیار ہوں" اور کریمہ بیگم کے سامنے جھک کر اس نے کہا "کیا آپ

یہ ناچ میرے ساتھ ناچ کر مجھے شرف بخشیں گی ؟"

کریمہ بیگم مسکرائیں، انھوں نے اپنی ساری کا آنچل ٹھیک کیا اور منہ ٹیڑھا کر کے بولیں "میں مجبور ہوں مجھے ناچنا بالکل نہیں آتا۔ پھر یکایک انھیں خیال آیا کہ ناچنا کتنی بُری اور ذلیل چیز ہے۔ انھیں ہندستانیوں خصوصاً مسلمان لڑکوں پر غصہ آیا جنھوں نے اس غیر ملک میں آکر اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنی رسموں کو اس طرح بھلا دیا تھا کہ انھیں ایک مسلمان ہندستانی لڑکی کے ناچنے کے خیال سے ذرا بھی شرم نہیں آتی تھی، انھوں نے طنزیہ لہجہ میں احسان سے کہا، معلوم ہوتا ہے آپ بھول گئے کہ ہمارے یہاں ناچنا معیوب سمجھا جاتا

اتنے میں پھر باجا بجنے لگا۔ لوگ پھر ناچنے لگے۔ لیکن احسان کریمہ بیگم کے قریب بیٹھ گیا

اس نے اپنے دل میں سوچا "کیا یہ لڑکی دراصل سنجیدگی سے ان معاملات پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہونچی ہے۔ یا صرف تنگ نظر قدامت پسندی کی وجہ سے یوں باتیں کر رہی ہے ؟ ہندستان سے جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ شروع شروع میں اکثر اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں میں خود دو برس پہلے ناچنے کے خلاف تھا۔ لیکن اب ...... اس کے خیالات شور و غل کے سبب سے منتشر ہو گئے" اس نے کریمہ بیگم سے کہا "جی نہیں میں اس بات کو بالکل نہیں بھولا ہوں کہ ہمارے یہاں ناچنا برا سمجھا جاتا ہے، لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے: اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے ؟ کون اس بات کا فیصلہ کریگا کہ فلاں رسم اچھی ہے اور فلاں رسم بری ہے ؟ یہی میرا دوسرا اعتراض آپ پر ہے آپ ہندستان سے اکیلی اتنی دور کفرستان میں آئیں، آپ پردہ نہیں کرتیں، آپ انگریزی زبان کی ماہر ہیں، آپ نے ساری جو ہندوؤں کا لباس ہے زیب تن فرمایا آپ رات کے وقت غیر مردوں کی محفل میں بے تکلف تشریف فرما ہیں، آپ مجھ سے زور و شور کے ساتھ بحث کر رہی ہیں، کیا یہ باتیں ہمارے یہاں معیوب نہیں سمجھی جاتیں ؟"

"میں نے یہ کب کہا کہ ہماری ہر بات اچھی ہے اور یورپ کی ہر بات بری ہے،

ہیں تو صرف یہاں کی اندھا دھند تقلید کے خلاف ہوں" کریمہ نے جواب دیا۔

" اور میں صرف مغرب ہی نہیں بلکہ ہر چیز کی اندھی تقلید کے خلاف ہوں" احسان نے بلند آواز میں کہا "ہندستان میں سیکڑوں برس تک زندہ عورتیں مردوں پرستی ہو جاتی تھیں اس لئے کہ یہ ان کا مذہبی فرض تھا۔ ساری دنیا میں سیکڑوں برس تک اپنے سے کمزور انسانوں کو غلام بنانا اور بردہ فروشی قریب قریب ہر ملک میں رائج تھی اور کوئی اس کے خلاف کچھ نہیں کہتا تھا، لیکن آج یہ چیزیں ہندستانی تاریخ کا تاریک ترین پہلو سمجھی جاتی ہیں۔ کل جو باتیں اچھی سمجھی جاتی تھیں، آج ہم ان کو برا سمجھتے ہیں۔ کیوں؟ صرف یہی نہیں، آپ یہ بھی دیکھیں گی کہ زندگی کے ہر اہم مسئلہ پر مختلف طبقہ کے لوگوں میں سخت اختلاف رائے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آج کل ایک گروہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی دماغی یا جسمانی قوتوں کو کام میں لا کر سوسائٹی کو فائدہ نہیں پہنچاتے وہ قوم کے جسم پر بدنما اور زہریلے آبلوں کی طرح ہیں، جن کو کاٹ کر پھینک دینا چاہئے۔ دوسرا گروہ دولت و ثروت کو موروثی ملک خیال کرتا ہے اور بے شرمی کے ساتھ دوسروں کی محنت کا پھل کھانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ کون غلط ہے اور کون صحیح؟ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ آپ کس طرح اس کی تمیز کریں گی؟" یہ شخص تو میرا سر کھا جائے گا۔ کریمہ بیگم نے سوچنا شروع کیا۔ "میں نے ایک بات کیا کہہ دی کہ یہ ڈنڈا لے کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ باتیں کرنا اسے خوب آتا ہے۔ باوجود اس کے"..... ان کے دل میں ان ہندستانی طالب علموں کی طرف سے نفرت کم نہیں ہوئی جو پڑھنے لکھنے کے لئے یورپ آئے اور یہاں آکر ناچ رنگ میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے والدین نے اسی لئے انہیں سات ہزار میل دور بھیجا ہے؟ شاید اسی وجہ سے میرے والدین اس کے خلاف تھے، کہ میں ولایت تعلیم کے لئے آؤں۔ لیکن میں اپنے زور بازو سے یہاں آئی۔ وظیفہ لے کر، میں ان لوگوں کی طرح نہیں جو اپنے والدین کی ساری بچی بچائی دولت

پھونک دیتے ہیں اور یہاں سے بہ مشکل امتحان پاس کرکے برسوں کے بعد گھر واپس جاتے ہیں۔ اور سونے پر سہاگہ تو یہ ہے کہ اکثر اپنے ساتھ ایک میم صاحب کو بھی لے جاتے ہیں ..... میں کیوں آج یہاں آئی ؟ میں نے بالکل ٹھیک کیا تھا جو ہندوستانیوں سے لندن میں ملنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ یہ احسان صاحب جو اس وقت بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہیں، یہ بھی کوئی پارسا نہیں، اس دن شفیع رسٹوراں میں آپ ایک انگریز لڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر دوسری طرف منہ موڑ لیا جیسے پہچانا ہی نہیں۔ جب کھانا ختم کرکے باہر جانے لگے تو میری میز کے قریب سے گزرنا پڑا۔ انھیں مجبوراً مجھے سلام کرنا ہی پڑا لیکن میں نے بھی اس طرح جواب دیا کہ یاد کرتے ہوں گے ..... "

" میں یہ سب کچھ نہیں جانتی " کریمہ بیگم نے جھنجھلا کر جواب دیا " لیکن ناچنے، شراب پینے، اور انگریز ..... عورتوں کے پیچھے گلیوں گلیوں مارے مارے پھرتے ہیں تو مجھے کوئی اچھائی نظر نہیں آتی "

" اور میں نے آپ سے یہ کب کہا کہ میں ان حرکتوں کو ہندوستانی طالبعلموں کی زندگی کا مدعا اور مقصد بنانا چاہتا ہوں ؟ " احسان کی آواز میں غصہ تھا۔

ایک طرف سے آواز آئی شراب کے اثر سے لڑکھڑائی ہوئی: " لندن لَ، لَ لندن، نفرت ہے مجھے اس شہر سے۔ کوئی بھی چیز تو یہاں پسند کی نہیں۔ پ پسند مَ مَ میں نے کہا پسند۔ جانتے ہو آج کیا واقعہ ہوا۔ میں آج دوپہر کو ریجنٹ پیلس گیا۔ ارادہ تھا کہ لڑکی پکڑ دوں۔ لڑکی ..... "

" ارے یار خان اتنے زور زور سے باتیں مت کرو۔ یہاں عورتیں بھی ہیں سنیں گی تو کیا کہیں گی " کسی نے التجا کی۔

" ایسی تیسی عورتوں کی۔ میرے اش سے۔ میرا کیا پی لیں گی کاٹ لیں گی۔ عورتیں ۔۔ سنو میرا قصہ! دو عورتیں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں ایک تو بڑھیا سی تھی مگر دوسری ذرا مزیدار

تھی، جوان، بار بار میری طرف دیکھتی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ مجھے مخاطب کرنا چاہتی ہے لیکن میں نے اپنے دل میں کہا کہ جوان تو ٹھیک ہے مگر بڑھیا کمبخت کو کیا کروں گا۔"

"کتنی بڑھیا تھی، اب ایسی بھی کیا ہوگی، لالچ ہوتے یار دونوں کو کسی اور کا فائدہ ہو جاتا۔" بات کاٹ کر ایک صاحب بولے۔

"بیچ میں مت بولو" خان نے بگڑ کر کہا "میں نے بھی اس نوجوان لڑکی کے ساتھ نظر بازی شروع کر دی، تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی ....."

"یار جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ یہ رعب کسی اور پہ جمانا۔ بڑی شان کی لیا کرتے تھے۔ ابھی اس دن میرے ساتھ تم جب ریجنٹ پیلس گئے تو کسی عورت نے تمہارے اوپر نظر نہیں ڈالی مسکرانا تو درکنار۔ ایسے آپ حسین نہیں ہیں کہ صورت دیکھ کر آپ پر عورتیں فریفتہ ہو جائیں۔"

"سنگھ! کہتا ہوں کہ بیچ میں مت بولو۔ ورنہ اچھی بات نہیں ہوگی" خان صاحب نے بگڑ کر کہا۔

"اچھا خیر آپ بڑے حسین سہی۔ بتاؤ تو ہوا کیا؟" سنگھ ہنس کر بولا۔

"پھر میں نے ان سے بات چیت شروع کر دی۔ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ اگر سنگھ میری جگہ پر ہوتے تو دیکھتے! ایک حرف ان کے منہ سے نہ نکلتا، جانتے ہو میں نے کس طرح گفتگو شروع کی؟" خان صاحب نے اکڑ کر پوچھا۔

"معلوم ہے مجھے" سنگھ نے کہا "آپ نے بڑی شان کے ساتھ واسکٹ کی جیب سے سونے کا سگریٹ کیس نکال کر ان غریب عورتوں کو عبداللہ سگرٹ پیش کئے ہوں گے۔"

"غلط غلط بالکل غلط" خان نے جھوم کر کہا "میری نظر اس جوان لڑکی کی انگلیوں پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک انگوٹھی پہنے ہوئے ہے۔ میں نے فوراً کہا! کس قدر عمدہ زمرد ہے! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ایک سکنڈ کے لئے مجھے اس بیش بہا نگینہ پر نظر

ڈالنے دیجئے۔ ہم مشرقی لوگ ان چیزوں کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ بس یہ کافی تھا۔ سمجھ گئی کہ میں کوئی ایسا ویسا ٹٹ پونجیا طالب علم نہیں ہوں۔ بلکہ رئیس ہوں جو اس طرح سے ہیرے جواہرات پر کھ رہا ہوں۔ بس لیجئے جناب سنگھ صاحب میں رئیس ہوں۔ میں یورپ اس لئے نہیں آیا ہوں کہ اسکول کے لونڈوں کی طرح صبح سے شام تک امتحان پاس کرنے کی فکر میں لگا رہوں۔ جتنے دن جی چاہے یہاں ٹھہروں اور جب جی چاہے یہاں سے واپس جا سکتا ہوں ..... واپس "

راؤ بھی خاں صاحب کے قریب کھڑا ہو کر ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے کہا "آپ تکلف کیوں فرما رہے کہہ دیجئے نہ صاف صاف کہ آپ پرنس ہیں، شہزادے ہیں، یورپ آکر تو چھوٹے سے چھوٹا ہندوستانی زمیندار اپنے کو شہزادہ سمجھنے لگتا ہے اور یہاں کی بھولی بھالی عورتوں پر رعب ڈالنے کے لئے اپنے نام کے آگے "پرنس" لگا لیتا ہے۔"

"کیا میرے رئیس ہونے میں کسی کو شک ہے؟" خاں صاحب نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "میں رئیس، میرا باپ رئیس، میرا پردادا رئیس، پشتہا پشت سے ہم رئیس چلے آتے ہیں میرے مورث اعلیٰ کو اکبر بادشاہ نے پنج ہزاری کا عہدہ دیا تھا۔ وہ بخارا سے سیدھے دہلی آئے تھے اور وہاں پہنچ کر اکبر بادشاہ کے دربار میں ان کا بہت بڑا رتبہ ہوا۔"

"تو یہ کون بڑے فخر کی بات ہے، اکبر کے گھوڑوں کی لید صاف کرتے کرتے ہو گئے کیا معلوم۔ نسل دیکھنا ہو تو مجھے دیکھو، چندر بنسی راجپوت ہوں۔ چاند کی اولاد۔ کبھی دشمن کے سامنے سر نہیں نیچا کیا۔" سنگھ نے کہا۔

"اور اب پنج ہزاری سردار کے صاحبزادے اور راجپوت سورما دونوں بیٹھ کر فخر سے انگریزوں کے بوٹ کی نوک چاٹتے ہیں۔" راؤ بولا۔

"اور تم کیا کرتے ہو؟" خاں اور سنگھ دونوں نے ایک ساتھ بگڑ کر پوچھا۔

"میں تو بیرسٹری کر رہا ہوں، تمہارے ایسے رئیسوں کی حماقتوں سے فائدہ اٹھا

کے لئے۔" راؤ نے ہنس کر جواب دیا۔

"تم سب کے سب رئیس، بنیئے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجنیئر سرکاری نوکر، جونک کی طرح ہو اور ہندستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک قایم نہیں رہے گی۔ کبھی نہ کبھی دن تو ہندستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے۔ بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔" احسان نے اپنے کرخت پنجابی لہجے میں کہا۔

"یہ بالشویک یہاں کہاں سے آگیا۔" خاں صاحب نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"جناب احسان صاحب آپ خود کیا کرتے ہیں جو اوروں پر اس طرح اعتراض کر رہے ہیں؟ آپ کے پاس جو ہر مہینہ گھر سے بیس پاونڈ آتے ہیں وہ آپکے والد کے پاس آسمان سے تو نہیں ٹپکتے۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ بھی سرکاری ملازم ہیں۔ ان کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ آپ ہی کے قول کے مطابق ہندستانی مزدوروں اور کسانوں کا خون ہے۔ یہاں ہندستان کے غریب لوگوں کی کون سی خدمت کر رہے ہیں؟ دوسرے ہندستانی طالب علموں کی طرح آپ بھی ڈگری لینے کے بعد نوکری کی تلاش کرینگے۔ تو پھر ہم پر اعتراض کرنے سے کیا فائدہ؟" سنگھ نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

احسان جواب دینے نہ پایا تھا کہ راؤ بول اٹھا۔

"مجھے احسان سے اتفاق ہے۔ ہماری حیثیت کسی طرح چوروں اور ڈاکوؤں سے بہتر نہیں۔ کون کہہ سکتا کہ ہندستان کی دولت جو ہم یہاں لٹا رہے ہیں ہم کو اس کا حق ہے؟ ہماری زندگی سے ہندوستان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ خاک پتھر۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جب تک اس دنیا میں اتنے بے وقوف لوگ موجود ہیں جو ہم ایسے بیکاروں کو اس بات کا موقعہ دیتے ہیں کہ دن دہاڑے ان کی جیب کتریں، جب تک ہندستان کے محنت مزدوری کرنے والوں کو جوتا کھانے میں مزا آتا ہے اس وقت تک ان بھیڑ کے گلوں کے

لئے سر کھپانا اور ان کی بھلائی کی کوشش کرنا محض تضیع اوقات ہے ہم لوگ جو خوش قسمت ہیں اور جن کے قبضہ میں تھوڑی بہت دولت لوٹ کھسوٹ کر آگئی ہے، ان کو چاہیئے کہ وہ بے فکری کے ساتھ خوب مزے اڑائیں۔ خدا معلوم کل کو کیا ہو!"

"ارے یار! خان صاحب نے چلا کر کہا "پالٹیکس کی باتیں ختم کرو۔ جہاں جاؤ سالی پالٹیکس دم کے پیچھے لگی رہتی ہے، اس سے تو نجات ملنی مشکل ہو گئی۔ بڑے آئے ہیں بالشویک بننے والے! ہندوستان کو بالشوزم سے کوئی تعلق نہیں۔ سُنتے ہیں کہ روس میں عورتیں عوامی ملک ہو گئیں جس کا جی چاہے جس عورت کے ساتھ......"

احسان جو کھڑا ہوا تھا خان صاحب کی طرف مڑا اور ان کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھ کر اس نے آہستہ آہستہ کہا "بس یہی سنا آپ نے روس کے بارے میں؟ ایک خبر اور سن لیجئے میں سُناتا ہوں۔ انقلاب کے پہلے آپ کی طرح کے جانور روس میں بھی پائے جاتے تھے بالشویکوں نے ان کو اپنے کھیتوں کی کھاد بنا ڈالا۔

چھ فٹ لمبے، لحیم شحیم، پنجابی نوجوان نے بیچارے خان صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس طرح سے جو باتیں کیں تو ڈر کے مارے ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ نازک بدن دبلے پتلے، رئیس زادے تھے اپنی کرسی پر دبک کر رہ گئے اور کھسیانے پن سے ہنس کر بولے "یار تم خفا ہو گئے! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم روس کے بارے میں۔ ایسی ہی سنی سنائی کہتا تھا۔

احسان جواب دیئے بغیر دوسری طرف مڑ کر کسی اور سے مخاطب ہو گیا۔

"ہلّو ایوری باڈی" دروازے کے پاس سے ایک نووارد لڑکی نے چلّا کر کہا — لوگ ناچ رہے تھے۔ ایک دو آدمیوں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر ناچ میں مشغول ہو گئے۔

لیکن اعظم کا دل دھڑکنے لگا۔ کیونکہ یہ جین کی آواز تھی۔ دو تین گھنٹہ دیر کر کے

آخر کار وہ آ ہی گئی۔ لیکن یہ انتظار کس قدر تکلیف دہ کتنا ناقابل برداشت تھا۔ اور اب جب اس کی آواز اعظم کے کانوں میں پڑی تو وہ تکلیف ایک ہیجان کی کیفیت سے بدل گئی۔ انتظار کے وقت اس کی حالت ایسی کمان کی طرح تھی جسے ایک زور آور شخص برابر کھینچتا چلا جاتا ہو، اور وہ اتنی تن جائے کہ اس سے زیادہ کھینچنا ناممکن ہو۔ اور اب اعظم کے جذبات اس طرح لرزاں تھے۔ جیسے اس انتہا تک تنی ہوئی کمان سے تیر مارنے کے فوراً بعد اس کا تانت تھرّاتا ہو۔

اعظم اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ کس طرح جین سے ملے لیکن جین کی نظروں نے چاروں طرف دیکھ کر اسے ڈھونڈھ نکالا وہ لپک کر اسی کے پاس گئی اور اعظم کے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف اٹھایا۔ اعظم چپ رہا، اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جین کی موجودگی کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کے دل کو سکون ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن صرف اس کے دل کی اوپری سطح کا یہ حال تھا۔ اس سطح کے نیچے حسد کا طوفان برپا تھا۔ محبت کی روشنی اس کے دل کے تاریک محشرستان میں چراغ کے لرزاں شعلہ کی طرح کمزور ہو کر بالکل غائب ہو جانے کے قریب تھی۔

"پلیز! پلیز! اتنے تو مجھ سے خفا مت ہو!" جین نے مسکرا کر کہا۔ "کیا مجھ سے بالکل بات چیت تک بند کر دو گے؟ میں نے بہت کوشش کی وقت پر آنے کی۔ لیکن کیا کروں کامیابی نہیں ہوئی۔ قصور میرا نہیں۔"

"تو کیا میرا قصور ہے؟!" اعظم نے اپنے دل میں کہا۔ پھر وہ زور سے بولا۔ "جین تین گھنٹے دیر کر کے آئی ہو ایک گھنٹے کے قریب میں نے رسل اسکوائر پر تمہارا انتظار کیا۔ اگر تم نے پہلے سے کہہ دیا ہوتا کہ وقت پر نہ آ سکو گی تو مجھے انتظار نہ کرنا پڑتا۔" یہ کہنے کے بعد اسے اس بات پر تعجب ہوا کہ اس نے اتنے نرم لہجے میں جین سے بات کی۔

جبین نے اعظم کے گال پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے اور اس کے سامنے قصوروار بچے کی طرح گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی اور کن انکھیوں سے اعظم کی طرف کبھی کبھی دیکھ لیتی۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن، ڈارلنگ، میں تو پہلے آنا چاہتی تھی، عین وقت پر کام میں پھنس گئی۔ کیا کروں۔ مجھے اپنے کپڑوں پر استری کرنا تھی، اس کے بعد۔ اس کے بعد میرے بھائی کے دوست آ گئے اور زبردستی بھائی کے ساتھ مجھے سینما گھسیٹ لے گئے۔ میں لاکھ کہتی رہی مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ بہت اچھی فلم تھی اور آج اس کا آخری دن تھا۔ اگر اب نہ جاتی تو پھر وہ تماشہ بالکل دیکھنے ہی میں نہ آتا"

"سینما جانا اور کپڑوں پر استری کرنا آپ کے نزدیک اتنا ضروری ہے کہ میرے تین گھنٹے بیکار ضائع کئے جائیں! تمہیں شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے کہ تم ضروری کام کی وجہ سے نہیں آ سکتی تھیں!" اعظم نے جھلا کر کہا۔ اسے ایک عجیب قسم کی افسردہ خوشی اس بات سے ہو رہی تھی کہ آخرکار جو کچھ اس کے دل میں تھا وہی اس کی زبان سے نکلا۔ اس طرح غصہ میں آ کر اس نے کبھی جبین سے باتیں نہیں کی تھیں۔ اس کے فوراً ہی بعد اسے سخت رنج کا احساس ہوا "کیا یہ وہی لڑکی ہے جسے دیکھ کر دو برس پہلے میں اپنے قابو سے باہر ہو گیا تھا؟" یہ دو برس کس طرح گذرے کبھی خوشی، کبھی رنج، کبھی پریشانی اور اب یہ وقت آ پہونچا کہ میں غصہ میں اس سے باتیں کر رہا ہوں۔ اور اس کی باتوں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ ہے میری معشوقہ۔ اس لڑکی سے مجھے عشق ہے۔ عشق! محبت؟ کیا میں دو برس سے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں؟ خوفناک خیال"۔ اتنے میں اعظم کے کانوں میں خاں صاحب کے بولنے کی آواز آئی:۔ "یار یہ کون چھوکری ہے۔ جو اعظم سے باتیں کر رہی ہے۔ غضب کی گرم معلوم ہوتی ہے۔ یار مجھے بہت پسند....."

"تم سے اتنی دفعہ کہہ دیا چلا کر مت باتیں کرو...... یہ لڑکی اعظم کی معشوقہ ہے اگر اس نے تمہاری باتیں سن لیں تو تمہارا سر توڑ دیگا" سنگھ نے کہا۔

اعظم کو خان صاحب کی بدتمیزی پر غصہ آیا۔ اس کا خیال بٹ گیا۔ جین نے اس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور اس کی گود میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا: "مجھے معاف کردو" اور یہ کہہ کر قبل اس کے کہ اعظم کچھ جواب دے اس کے لبوں کا بوسہ لے لیا۔

اسی وقت راؤ ان کے پاس سے گذرا اور اس نے ہنس کر کہا "یہاں بیہاں اس کی اجازت نہیں"۔

جین ایک دم اعظم کی گود سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ راؤ نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا "خوب آپ نے ہم لوگوں کو سردی میں ایک گھنٹہ رسل اسکوائر پر کھڑا رکھا"۔

"مجھے بہت افسوس ہے" جین نے کہا "مسٹر راؤ آپ اعظم سے میری سفارش کر دیجئے۔ یہ مجھ سے اتنے خفا ہیں کہ بات تک نہیں کرتے"۔

"ارے اعظم" راؤ نے کہا "احمق مت بنو جو کچھ ہونا تھا ہو ا۔ اٹھو اور جین کے ساتھ ناچو"۔

"ہاں۔ آؤ" جین نے کہا اور اعظم کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹ کر کرسی سے اٹھایا۔

گراموفون بج رہا تھا اور اس سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

عشق ہمیں زندہ کرتا ہے،
عشق ہمیں بچا لیتا ہے،
عشق ہمیں خوش کرتا ہے،
عشق ہمیں غمگین کرتا ہے،
عشق! عجیب و غریب عشق!

جین اور اعظم ساتھ ساتھ ناچنے لگے۔

عارف گھر جانے کی فکر میں تھا۔ اس کی شام ساری ضائع گئی۔ ساری شام خیال تو کرو اتنی دیر میں کتنا کام ہو سکتا تھا۔ زبانی امتحان میں طرح طرح کے بے ڈھنگے سوال پوچھے جاتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اخبار پڑھتا رہے۔ اسی وجہ سے عارف ہر روز "ٹائمز" وظیفہ کی طرح پڑھتا تھا اور کبھی کبھی اس میں سے اچھے اچھے جملے ایک علیحدہ کاپی پر نقل بھی کر لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ ان جملوں کو زبانی یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ اکثر دوستوں کے ساتھ گفتگو میں وہ اس طرح کی باتیں کرتا تھا جس کے دوران میں یہ چنے ہوئے جملے استعمال کر سکے۔ اسے امید تھی کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ نہ صرف اسکی انگریزی زبان کی مہارت ہو جائیگی بلکہ "ٹائمز" اخبار کے خیالات اس کے دماغ میں اچھی طرح سے جم جائیں گے۔ اس اخبار کا نقطۂ نظر انگلستان کے "بڑے صاحبوں" کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ جو بات "ٹائمز" میں چھپ جائے اسے "نیم سرکاری" سمجھنا چاہیئے۔ عارف چاہتا تھا کہ وہ سرکاری خیالات میں بالکل ڈوب جائے اور جب امتحان کا وقت آئے تو اس کے قلم سے اور اس کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے جس سے امیر ممتحنوں کو کسی قسم کا اختلاف ہو سکے۔ اوروں کی رائے کو اپنا بناتے بناتے اس کا دماغ گراموفون کی طرح ہو گیا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس بالکل نہیں تھا۔ جھوٹے، نقلی سکے استعمال کرنے کی اس کو اتنی عادت ہو گئی تھی کہ وہ انکھیں سچا سمجھنے لگا تھا۔ اور کیوں اس کی ذہنیت ایسی نہ ہوتی؟ اس کے خاندان میں دن رات اس بات کی دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ کسی طرح سے وہ آئی، سی، ایس کے امتحان میں کامیاب ہو۔ ہندوستان میں یونیورسٹی کے طالب علموں میں اکثر کا منصوبہ یہی ہوتا ہے کہ وہ سرکاری نوکری کریں اس کے اکثر دوست کسی نہ کسی طرح، ہر قسم کے امتحان کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔

انگلستان میں بھی زیادہ تر ہندستانی طالب علم اسی زمرہ میں گنے جا سکتے ہیں۔ تھوڑے سے جو اس زمرہ سے باہر تھے عارف ان سے ہمیشہ دور دور رہتا۔ صرف ایک نعیم الدین ایسا شخص تھا جس کے یہاں عارف دو سرے تیسرے مہینے آجایا کرتا تھا اور اس کی بھی یہ وجہ تھی کہ نعیم اس کا دور کا رشتے دار ہوتا تھا اس کے علاوہ ہندستانی طالب علموں کے یونین میں کبھی کبھار چلا جاتا۔ ہندستانی "کڑھی" اور چاول کھانے کے لئے۔ لیکن وہ ہمیشہ دیکھ بھال کر ایسے ہی طالبعلموں کے ساتھ میز پر بیٹھتا تھا جو اس کی طرح کسی سرکاری امتحان کی تیاری کرتے ہوتے۔ اسے وہ واقعہ یاد تھا جب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے ایک دفعہ احسان اور راؤ کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا پڑا۔ اور احسان نے اس سے سخت بے تکے سوال پوچھنا شروع کئے۔ اور طنز و طعن کی وجہ سے چین سے کھانا مشکل کر دیا۔ احسان نے اس سے پوچھا" عارف صاحب اگر آپ کسی ضلع میں مجسٹریٹ ہوئے اور ہم لوگوں نے وہاں سیاسی شورش شروع کی تو آپ ہمیں جیل خانے بھیجیں گے یا نہیں؟ آپ ہمارے جلوسوں پر گولی چلانے کا حکم دیں گے یا نہیں؟"

اور اس نے پریشان ہو کر جواب دیا تھا "ڈیوٹی از ڈیوٹی" لیکن آپ یہ کیوں فرض کرتے ہیں کہ میں بے قصور لوگوں کو قید کر دوں گا۔ اور بے جرموں پر گولیاں چلواؤں گا؟

اس جواب پر احسان زور سے قہقہہ مار کر ہنسا تھا اور اس نے کہا تھا: "تو یہ کہئے آپ نے ابھی سے غیر ملکی انگریزی حکومت کی "ڈیوٹی" کو اپنی "ڈیوٹی" تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس کو بجا لانے کے لئے بالکل تیار ہیں!"۔

"تو اور کیا کریں؟" راؤ نے کہا تھا: "سرکار کا حکم بجا لانے کے فائدے ظاہر ہیں دولت، طاقت اور تھوڑی بہت غریب نیٹوز پر حکومت۔ تم ایسے پاگلوں کا ساتھ دینے میں ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں۔ الٹے نقصان ہی ہے۔ پہلے تو کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ آپ لاکھ آزادی آزادی چلایا کریں۔ اگر بہت گلا پھاڑا، آسمان سر پر اٹھایا، تو پھر

جیل خانے کی ہوا کھایئے ابیوی بچے بھوکے مریں اور تین برس بعد جب قید سے نکلیے تو وہاں کی ندیت ملی ہوئی روٹیاں کھاتے کھاتے صحت ایسی لاجواب ہوجاتی ہے کہ کیا کہنا. بس اس کے بعد صرف ایک راستہ کھلا رہ جاتا ہے اعبادت کا گھر میں بیٹھ کر خدا کو یاد کیجیے اور تھوڑے دنوں کے بعد دوسری دنیا کو سدھار یئے. جب دوسرا راستہ اس منزل پر پہونچاتا ہو تو پھر عارف نے کیا قصور کیا اگر انگریزی راستہ پکڑا ؟

" ٹھیک ٹھیک! بالکل ٹھیک." احسان نے کہا: اکبر کہہ گیا ہے نا: - ع

کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا!

" مشکل صرف یہ ہے کہ اب تو ڈبل روٹی اور کلرکی بھی نہیں ملتی. اس لئے ہم "شریف" نوجوانوں میں اکثر کو بھوکوں کی پلٹن میں شامل ہونا پڑتا ہے."

اسی طرح گفتگو کا سلسلہ جاری رہا آخر کار عارف جلدی جلدی کھانا کھا کر اس میز سے اٹھ گیا. خدا خدا کر کے اسے ان آزاد خیال طالب علموں سے نجات ملی تھی اس کے دل میں اس قسم کے طالب علموں کی طرف سے ایک قسم کی نفرت سی تھی.

" یہ ہم لوگوں سے حسد کرتے ہیں" عارف کا خیال تھا " وہی نوکریاں جن کا یہ مذاق اڑاتے ہیں اگر ان کو مل جائیں تو خود بڑی خوشی سے قبول کر لیں گے اور پھر تمام نیشنلزم اور بالشویزم ہمیشہ کے لئے بھلا دیں گے. اصل میں یہ لوگ محنت سے بھاگتے ہیں! جانتے ہیں کہ کبھی ان سے مشکل امتحان پاس نہ کئے جائیں گے، اس لئے لندن میں بیٹھ کر خوب پالیٹکس بگھارتے ہیں اور گورنمنٹ کو گالیاں دیتے ہیں. ہندوستان پہونچ ساری شیخی نکل جاتی ہے جس مجسٹریٹ کا یہاں مذاق اڑاتے ہیں اسی کو سلام کرنے روز اس کے بنگلے پر پہونچتے ہیں اور اس کے اردلی تک کی ڈانٹ سنتے ہیں."

عارف نے دیکھا کہ راؤ اور احسان ایک کونے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اسے اس بات سے خوشی ہوئی کہ وہ دونوں اس کے پاس نہیں. عارف نہیں چاہتا تھا.

کہ ان لوگوں کے حلقہ میں پھنسے۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ کمرے میں جو لڑکیاں تھیں ان پر اس نے نظر ڈالی اسے بیساختہ خواہش ہوئی کہ کسی لڑکی سے وہ بھی بے اس کے ساتھ ناچے اور پھر اس کی صحبت کا لطف اٹھائے، جو شکست اس کو ہوئی وہ ابھی تک اس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر وہاں کوئی لڑکی اس کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئی تو وہ پکاڈلی کے قریب گلیوں میں سے کسی سڑک پر ٹہلنے والی کسی رنڈی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔

کمرے میں سگرٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ روشنی بھی کچھ زیادہ تیز نہیں تھی آتشدان میں انگارے دہک رہے تھے ان میں سے شعلے نکلنا بند ہو گئے تھے۔ سیاہ پردوں کے پیچھے کوئی لڑکا معلوم ہوتا تھا کسی لڑکی کو پیار کر رہا ہے، لڑکی کی دبی ہوئی ہنسی کی آواز موسیقی کی چیخ، گفتگو، قہقہہ، ناچتے ہوئے جوڑوں کا بار بار گھومنا، یہ سب چیزیں عارف کی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا کر رہی تھیں۔

وہ ایک سیاہ بالوں والی چھوٹی موٹی لڑکی کے پاس گیا اور مسکرا کر اس سے پوچھا "کیا اب کی بار آپ میرے ساتھ ناچیں گی؟"

لڑکی عارف کی طرف مڑی اور اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ "ضرور"

عارف اس کے ساتھ ناچنے لگا۔ اسے اس لڑکی کی شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نرم اور نازک جسم اس کے دل اور دماغ کو گرمی پہنچا رہا ہے۔

داؤ نعیم الدین کو الگ لے جا کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"ارے نعیم! تمہیں کیا ہو گیا؟ میں نے آج تک تمہیں کسی کے لئے سرگرداں نہیں پایا لیکن آج تم شیلا کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ کئی گھنٹے سے تم اسی کے گرد منڈلا رہے ہو کم سے کم تمہیں یہ تو خیال کرنا چاہیئے کہ میں نے اسے یہاں مدعو کیا ہے اور وہ میری دوست

ہے! یا تو آپ کسی لڑکی پر نظر ہی نہیں ڈالتے تھے۔ یا آپ کی طبیعت کسی عورت کی طرف مائل بھی ہوئی تو ایک دوست کی چیز پر ڈورے ڈالنے لگے!"

نعیم ہنسا "درجنوں لڑکیاں تمہاری دوست ہیں اگر ایک کم ہوگئی تو تمہیں معلوم ہوگا نہ ہوگا۔ لیکن سچ بتاؤ کیا شیلا سے واقعی تمہیں دلچسپی ہے؟" راؤ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ شیلا بول اٹھی۔

"یہ میرے خلاف آپ دونوں کیا سازش کر رہے ہیں؟" شیلا کی ہنستی ہوئی آواز ذرا دور سے آئی۔ اس نے نعیم اور راؤ کی باتوں میں اپنا نام شاید سن لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور راؤ اور نعیم کے بیچ میں کھڑی ہوگئی۔

"تمہارے خلاف سازش! بھلا کس کی مجال ہے" راؤ نے کہا۔ "اس وقت تو بحث یہ تھی کہ تم سے عشق کیا جاسکتا ہے یا نہیں!"

نعیم کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اسے راؤ پر کچھ غصہ سا آیا۔ اس نے سوچا کہ شیلا اپنے دل میں اسے کتنا احمق خیال کرتی ہوگی۔

"یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے" شیلا نے مسکرا کر کہا۔ "اور آپ لوگ کس نتیجے پر پہونچے؟"

"وہی جو میں تم سے ہمیشہ سے کہتا چلا آیا ہوں۔ کہ تم عشق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتی ہو۔ جنسی تعلقات کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں اور باقی جو کچھ محبت کے بارے میں لوگ کہتے ہیں وہ سب اصلیت کو چھپانے کے لئے شاعری کے پردے ہیں۔ چونکہ ہم ہندستانیوں میں تم مغربی وحشیوں کے مقابلے میں روحانیت زیادہ ہوتی ہے" اس لئے ہم ہر چیز کی اصلیت کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں اور حقیقت کے راستے پر تم سے زیادہ آسانی کے ساتھ پہونچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کی جڑ تک پہنچ کر ہماری سوسائٹی نے اس کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ہم نے اپنے گھروں سے عشق و محبت کو کوڑے کی طرح نکال کر

پھینک دیا۔ جیسے کابک کے خانوں میں بند کر کے کبوتروں کے جوڑے لگائے جاتے ہیں اسی طرح ہمارے یہاں نرا دسادہ انسان بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ ایک کوٹھری میں بند کر دیئے جاتے ہیں اس رسم کو ہم "شادی" کہتے ہیں۔ ضرور کسی دل لگی باز نے یہ نام رکھا ہوگا مس شیلا گرین آپ بہت سے ہندستانیوں سے ملیں مگر معلوم ہوتا ہے آپ پر ہماری روحانی تہذیب کا ذرا بھی اثر نہیں پڑا۔

شیلا ہنسنے لگی نعیم بھی مسکرا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ راؤ کے اس بے تکلفی سے باتیں کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں ؟ کیا وہ شیلا پر عاشق ہے ؟ نہیں اگر ایسا ہوتا تو اس نے مجھ سے ضرور اس بات کا ذکر کیا ہوتا۔ شاید راؤ اور اس لڑکی کا کالج میں ساتھ رہا ہو۔ اور وہیں ان دونوں کی دوستی ہو گئی ہو۔ اچھا ہوا کہ راؤ اس قسم کی باتیں شیلا سے کر رہا تھا۔ اگرچہ نعیم خود کسی لڑکی سے اس طرح کھلی ہوئی باتیں کبھی نہ کر سکتا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ چونکہ وہ اس گفتگو میں شامل تھا اس لئے وہ بھی شیلا کے ساتھ اب بے تکلفی کا برتاؤ کر سکے گا۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا وہ اُن ضرورت سے زیادہ "مہذب" عورتوں میں نہیں تھی جن کے ساتھ دل کھول کر باتیں کرتے ہوئے اس وجہ سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا لفظ استعمال نہ ہو جائے۔ جسے وہ ناشائستہ خیال کریں۔

شیلا نے ہنس کر کہا "اور تم اس روحانی تہذیب کے کتنے اچھے نمونے ہو! میں تو ضرور تمہاری روحانیت کا شکار ہو جاتی اگر تمہارا جسمانی حسن اتنے غضب کا نہ ہوتا۔ تمہارے ساتھ کوٹھری میں بند ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا! تمہیں دیکھ کر تو مندر کے پجاریوں کی طرح سر بسجود ہونے کی خواہش ہوتی ہے!"

راؤ بھی ہنسنے لگا "اب میں خودکشی کروں گا" اس نے کہا "میری باتوں کا تم پہ کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ ہر مرتبہ جب میں تم سے اظہار عشق کرتا ہوں، تم کوئی نیا عذر، کوئی نیا بہانہ، کوئی نئی بات نکال کر مجھے ٹال دیتی ہو۔ مشرق کی روحانیت، مغرب کی مادیت،

میرا حسن! اپنی جوانی کسی چیز کا بھی تو آپ خیال نہیں کرتیں۔ شیلا گرین! میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا۔ میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ!"

وہ شیلا کے سامنے جھکا اور پھر مڑ کر ہنستا ہوا کمرے کے دوسرے حصّے میں چلا گیا جیسے سپاہی میدانِ جنگ پر شہید ہونے کے لئے جاتا ہو۔ اور وہاں جا کر وہ دوسرے لوگوں سے ہنسی مذاق کرنے لگا۔ شیلا اور نعیم اپنی جگہ پر اکیلے کھڑے رہ گئے۔

"مجھے راؤ پسند ہے" شیلا نے نعیم سے کہا "میں کئی برس سے اس سے واقف ہوں لیکن اس شخص میں میں نے کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائی۔ اس سے باتیں کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں کسی چیز کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا خصوصاً وہ چیزیں جنھیں عام انسان عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو کوئی راؤ کو اچھی طرح نہیں جانتا وہ اس سے پہلی بار مل کر ضرور یہی سمجھتا ہوگا کہ اس شخص کا دل پتھر کا ہے، نہ تو اسے کسی چیز سے اُنس ہے اور نہ کسی چیز کا لحاظ۔ لیکن دراصل ایسا نہیں!"

"میرا بھی وہ بہت عزیز دوست ہے" نعیم نے کہا "اور میرے جاننے والوں میں وہ سب سے زیادہ ذہین طالبِ علم ہے لیکن کبھی کبھی مجھے اس کی ذہانت بیکار اور بے فیض سی معلوم ہوتی ہے۔ آسانی سے امتحان پاس کر لینا اور مزے دار باتیں کرنا ہمارے لئے کافی نہیں، مجھے جب کبھی اس بات کا خیال آتا ہے کہ راؤ یہاں سے واپس جا کر ہندستان میں کیا کرے گا۔ تو میری سمجھ میں اس سوال کا کچھ جواب نہیں آتا۔ اکثر ہندستانی طالب علموں کے بارے میں مجھے یہ فکر نہیں ہوتی، دنیا میں ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ لیکن راؤ جو اپنی ذہانت کی وجہ سے ہر بات کو فوراً سمجھ لیتا ہے، ہر بات کی تہ تک ایک منٹ میں پہنچ جاتا ہے وہ بھی اگر اسی گروہ میں گم ہو جائے تو مجھے رنج ہوگا!"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو نعیم۔ ہندستانی طالب علم اتنی بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں، کہ زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر باتونی میں نے اور کسی قوم کو

نہیں پایا۔ وہ گھنٹوں تک مسلسل اصل مضمون کو چھوڑ کر ذرا ذرا سے نکتوں پر بحث کرتے چلے جاتے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں تو ایک دوسرے کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں اور چلاتے اس قدر ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپس میں مارپیٹ ہو جائیگی۔ جب کبھی میں ہندستانی طالب علموں سے ملتی ہوں تو میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جن کو باتوں میں اس قدر انہماک معلوم ہوتا ہے اور جن کی نظروں میں اس قدر کشش ہے کیا ان کی زندگی بھی جوش وخروش سے بھری ہوئی ہے؟" وہ رک گئی۔ نعیم بھی کچھ نہیں بولا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد شیلا نے آہستہ سے کہا "کم از کم ایک ہندوستانی کو تو میں جانتی ہوں جس کے بارے میں اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔

نعیم نے بیساختہ سوال کیا "کون؟ اس کا کیا نام ہے"

"تم اسے نہ جانتے ہوگے۔ کئی برس ہوئے اس سے سوئٹزرلینڈ میں ملی تھی...."

پھر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "نعیم کیا تم ناچتے نہیں؟ میں اتنی دیر سے تمہارے یہاں ہوں تم نے ایکبار بھی مجھے ناچنے کی دعوت نہیں دی۔ واہ! آپ اچھے میزبان ہیں!"

نعیم فوراً سمجھ گیا کہ شیلا صرف بات ٹالنے کے لئے یہ کہہ رہی ہے وہ مسکرا رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں غمگینی جھلک رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کمرے میں قید ہے۔ ہر چیز اور ہر شخص اس وقت اس پر بار ہو رہا ہے۔ خود اپنی آواز جیسے کھوکھلی، بے رنگ معلوم ہو رہی ہے اس نے نعیم کی طرف یوں دیکھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی زبان سے التجا کئے بغیر اس کی "مدد" اس کی ہمدردی کی خواستگار ہے۔ کیوں؟ کیوں؟ نعیم نے اپنے دل میں سوال کیا۔ اور یہ سوال بندوق کی گولی کی طرح دل ودماغ کے پار ہو گیا۔"

"مجھے ناچنا اچھی طرح نہیں آتا" نعیم نے کہا "تمہیں میرے ساتھ ناچنے میں بالکل لطف نہ آئے گا۔ لیکن اگر تم اپنے پیروں کے لئے جانے کی پروا نہ کرو۔ تو میں بخوشی تمہارے ساتھ ناچوں گا"

"اگر اس کا مجھے ڈر ہوتا تو مجھے آج تک ناچنا نہ آتا" شیلا نے ہنس کر کہا۔

شیلا اور نعیم نے ناچنا شروع کیا۔ ان کے پاؤں موسیقی کے تال کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ لیکن ان میں ایک قسم کی آہستگی، ایک قسم کا بھاری پن تھا۔

نعیم کا منہ اور اس کی ناک شیلا کے بالوں سے کبھی کبھی چھو جاتے تھے۔ شیلا کا دایاں ہاتھ نعیم کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ شیلا کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔ اس نے اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔

نعیم کے دل میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس بیخودی کے عالم میں کبھی کبھی ایک دھندلا سا خیال اس کے دماغ میں آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔

"یہ مسرت جو اس لڑکی کے قریب ہونے سے میرے رگ و پے میں بجلی کی طرح سرایت کر گئی ہے کتنی دیر قائم رہے گی؟"

"نعیم، نعیم کیا تمہیں اس لڑکی سے محبت ہو گئی؟"

"محبت کا نام کیوں بدنام کرتے ہو! تم سمجھتے بھی ہو محبت کیا ہے۔ تم پر بیخودی سی چھائی جا رہی ہے۔"

"نعیم، تمہارا دل محبت کے لئے بنا ہے۔ جس طرح شہد کے چھتے میں شہد بھرا ہوتا ہے۔"

"تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بدنصیب! تمہیں ابھی تک یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ تم اس لائق نہیں!؟"

"تم پیار سے ہی نہیں۔ تمہارا دل بیکاری کی وجہ سے اب کسی کام کا نہیں رہا۔ تم ان مسافروں سے بھی بدتر ہو جو تھک کر راستے میں گر پڑے یا جو واپس جانے پر آمادہ ہیں۔ تم چلے ہی نہیں۔"

"آہ! لیکن اس کے لب! ان کی حلاوت! ان کی نرمی! ان کی حرارت آمیز تری

اس کی پلکیں جو بار بار اتنی خاموشی سے ہلتی ہیں اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وہ دو یکبارگی تیز چمکتے ہوئے نقطے جو ادھر سے اُدھر ہوتے رہتے ہیں! اس کا سارا جسم۔ یہ سب میرے ہیں انھیں میرا ہونا چاہیئے!"

"اس دنیا میں آج تک کوئی چیز مفت ملی ہے؟ تمہارے پاس کیا ہے؟"

"تو کیا میری نجات کی کوئی صورت نہیں؟ خوشی کے سب دروازے میرے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے؟"

جب تک ناچ ہوتا رہا شیلا اور نعیم پر کامل سکوت چھایا رہا۔ باجے کے یکبارگی رُک جانے سے وہ جیسے ایک خواب سے چونک اٹھے۔ وہ بھی رُک گئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے کے ایک گوشہ کی طرف بڑھے۔ اور وہاں پہونچکر نعیم نے بہت آہستہ سے اتنی دھیمی آواز میں جو مشکل سے سنائی دیتی صرف ایک لفظ کہا "شیلا" اور اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

شیلا نے بھی بہت آہستہ سے کہا "نعیم" اور اس کے ہاتھ کو ذرا سا دبا کر چھوڑ دیا۔

۶

(۱)

رات کا کوئی ایک بجا ہوگا کہ نعیم الدین کے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ سب کی نظریں اس کی طرف مڑ گئیں۔ یہ مالک مکان تھی بڑھیا عورت دوبلی، لمبے قد کی، اس کے بال سفید تھے اور وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

"مسٹر نعیم" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "میں آپ سے ایک منٹ کے لئے علیحدہ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

نعیم نے باجہ روک دیا۔ کمرے کا شور وغل بھی کم ہو گیا۔ ہر شخص کے چہرے سے، اس نووارد بڑھیا کے اس طرح سے ان کے عیش و عشرت میں خلل انداز ہونیکی وجہ سے جھنجھلاہٹ اور غصہ معلوم ہوتا تھا۔

نعیم نے بحیثیت میزبان ہونے کے اس بے لطفی کو محسوس کیا اور اس نے پکار کر کہا "سب لوگ بدستور بات چیت، ناچنا جاری رکھیں، میں ابھی واپس آتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر وہ دروازہ کی طرف بڑھا جہاں اس کی لینڈ لیڈی کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ شیطان کی خالہ کون ہے؟ یہاں کس لئے گھس آئی؟" خالصاحب نے چلا کر کہا۔

"چلا دُمت خان، لینڈ لیڈی ہے۔ گھر سے نکال دے گی تو ساری شیخی رکھی رہ جائیگی"
سنگھ نے خان صاحب سے ڈانٹ کر کہا۔ لیکن وہ اتنی پی گئے تھے کہ اپنے ہوش میں نہیں تھے۔
"مجھے کوئی شالا یہاں سے نکال نہیں سکتا" انھوں نے جھوم کر کہا۔ انگریزی میں گالی دے کر۔

اتنے میں کسی نے کمرے میں اچھی طرح روشنی کر دی اور لینڈ لیڈی نے ناک اونچی کر کے سارے گروہ پر نظر ڈالی۔ کوئی فرش پر لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ کوئی آگ کے قریب اپنی معشوقہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے بیٹھا ہوا تھا! کوئی پردوں کی آڑ میں چھپا کھڑا تھا۔ کوئی اُدھر تھا۔ کوئی اُدھر خان صاحب کی طرف بڑھیا نے گھور کر دیکھا اور فوراً دروازہ کھول کر واپس چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ نعیم بھی باہر گیا۔

"بس دم نکل گیا نہ! بڑھیا نے ایک نظر ڈالی کہ آپ کی بولتی بند ہو گئی" سنگھ نے خان کو چڑھانے کے لئے کہا۔

خان صاحب غصّہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور کمرے کے بیچوں بیچ لڑکھڑاتے ہوئے پہونچے اور انھوں نے جھوم جھوم کر، چاروں طرف ہاتھ ہلا ہلا کر کہا "سنگھ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ڈر کے مارے چپ ہو گیا۔ یہ جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ کوئی مجھ کو چپ نہیں کرا سکتا میں چیلنج کرتا ہوں سب کو اس مجمع میں۔ میں یہاں کھڑا ہو کر باتیں کرنا شروع کرتا ہوں۔ کوئی گھڑی لے کر بیٹھ جائے اور جتنی دیر تک میں بولتا جاؤں اسے نوٹ کرے۔ اگر کوئی مجھ سے زیادہ دیر تک بولیں تو میں ان کو ایک پاؤنڈ دوں گا اور اگر میں جیتوں گا تو وہ مجھے بھی اتنی رقم دیں"
جتنے لڑکے اور لڑکیاں کمرے میں تھے وہ سب یہ سن کر ہنسنے لگے۔ لوگ لینڈ لیڈی کے آنے کو بھول گئے اور سب نے خان صاحب کی باتیں سن کر تالی بجانا شروع کی۔

راؤ نے پکار کر کہا "ہے کوئی خان کے چیلنج کو قبول کرنے والا؟ سنگھ تم خان کو چھیڑتے رہتے ہو اب تمہیں کو چاہیے کہ ان کی شرط قبول کر لو"

"اچھی بات ہے" سنگھ نے کہا "بشرطیکہ خان صاحب پہلے بولنا شروع کریں اور جب تک تھک نہ جائیں اور کسی وجہ سے بولنا نہ روکیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ خان صاحب آپ کا چیلنج قبول ہوگیا۔ شروع کیجئے۔ اس وقت ایک بج کر ساڑھے بارہ منٹ ہوئے ہیں۔ آپ تیار ہیں؟ ایک ..... دو ..... تین ..... اسٹارٹ!" راؤ گھڑی لے کر خان کے پاس کھڑا ہوگیا۔

لوگ چاروں طرف سے جمع ہو کر خان کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

"ایک تو ذرا اچھی تھی، مگر دوسری کم بخت بڑھیا کھوسٹ، ....." خانصاحب نے اپنی داستان شروع کی۔

"ارے واہ یہ قصّہ تو تم بیان کرچکے ہو۔ اب کچھ اور کہو" کسی نے کہا۔

خاں صاحب نے معلوم ہوتا تھا اس کی بات بالکل سنی ہی نہیں۔ انھوں نے اپنی کہانی جاری رکھی، "مجبوری تھی، سخت مجبوری، آخرکار دونوں کو مجھے کھانا کھلانا پڑا۔ اب میں سمجھا کہ بڑھیا سے تو کم از کم نجات ملے گی لیکن یار وہ کھسکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی، دوسری سے بھی باتیں کرنی مشکل ہوگئیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ" — "کس رستوران میں کھانا کھلایا تھا؟ سنگھ نے آہستہ سے پوچھ ہی لیا۔

خان صاحب بولتے بولتے رُک گئے۔ ایکبارگی وہ غصّہ میں سنگھ کی طرف مڑے اور انھوں نے چلا کر کہا "شرط گئی ایسی تیسی میں۔ واللہ اگر میں آج سے تم سے بات تک کروں تو میں پٹھان کا نہیں، چمار کا نطفہ ہوں! تم کیا سمجھتے ہو میرے پاس دو لڑکیوں کو کھانا کھلانے کے پیسے نہیں جو ایسے سوال کرتے ہو! بڑے آئے ہیں پوچھنے والے کسی رستوران میں کھلایا تھا "تم سے مطلب؟"

"خانصاحب خفا ہونیکی شرط نہیں۔ یوں آپ رئیس ہیں، ایک پاؤنڈ کیا دس پونڈ آپکے لئے کوئی چیز نہیں۔ دینا چاہتے ہوں تو چپ ہو جائیے۔ آپ کو اختیار ہے۔" راؤ نے کہا۔

"چپ ہونے والے پر لعنت!" خاں صاحب کڑک کر بولے، لیکن اب ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ان سے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ اُن کے ہوش و حواس بالکل درست نہیں تھے اُنھوں نے چلا چلا کر گانا شروع کیا عجیب پھٹی پھٹی سی بھیانک آوازیں :-

کافر ہے جو سجدہ آ آ کرے بت خانہ سمجھ کر
سر رکھ دیا آ آ ہم نے در جانانہ سمجھ کر
در جانانہ سمجھ کر، اسے در جانانہ ...."

اور یہ کہتے کہتے وہ دھڑ سے فرش پر گر پڑے، لوگ زور سے قہقہہ مار کر ہنسے، لیکن خاں صاحب نیچے پڑے پڑے "کافر ہے، ہے کافر ہے ......" کے نعرے لگاتے رہے اتنے میں کسی نے گراموفون چلا دیا، ہنسی، چیخ، زور زور سے گفتگو، ناچ، سگرٹ کا دھواں، ایک دو آدمی کونے میں بیٹھے ہوئے خاموش، جوان سب چیزوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس لڑکی کے پریشان بال، اس کی متوحش آنکھیں، اس لڑکے کی آواز میں لجاجت اس کی باتوں میں غصہ، محفل میں وہ شروع کی سی شگفتگی باقی نہیں رہی تھی، رات اب زیادہ گذر گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص خوش ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

نعیم الدین کمرے میں واپس آیا اور اس نے فوراً گراموفون بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا "میری لینڈ لیڈی کہتی ہے کہ شور بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ کل مجھے اس گھر کو چھوڑ دینا پڑے گا۔"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اب اپنے اپنے گھر کا راستہ لینا چاہیئے۔" داؤد نے کہا۔

"تم تو میرے قریب ہی رہتے ہو نا؟ آؤ چلو ساتھ چلیں گے۔"

"کیا میں آپ کو اپنے موٹر میں گھر پہونچا سکتا ہوں؟"

"ضرور، شکریہ" کی آوازیں آنے لگیں۔

اور نعیم، شیلا کے پاس آیا۔ وہ بھی اپنا کوٹ پہن رہی تھی۔

"آپ بھی جا رہی ہیں!" اس نے کہا۔

شیلا نے مڑ کر نعیم کی طرف دیکھا، مگر اس کی بات کا کچھ جواب نہیں دیا۔

"تھوڑی دیر تو اور ٹھہریئے" نعیم نے پھر کہا۔

"بہت اچھا" اس نے جواب دیا، اور کھڑکی کے پاس جا کر اکیلی کھڑی ہو گئی۔

نعیم اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے میں مشغول ہو گیا۔

(۳)

عارف اور وہ لڑکی جس کے ساتھ وہ ناچ رہا تھا، ایک ساتھ گھر سے نکلے۔ کہرہ غائب ہو گیا تھا اور بجلی کی روشنیاں، جاڑے کی ٹھنڈی ہوا میں تیزی سے چمک رہی تھیں سڑک کے کنارے درخت، جن کی شاخیں پتیوں سے بالکل خالی تھیں، چپ چاپ کھڑے ہوئے تھے عارف کو سردی معلوم ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے نزلہ نہ ہو جائے۔ ایک گرم اور بند کمرے سے یکبارگی اس طرح کھلے میں نکل آنا اچھا نہیں۔ اسے اس ہندستانی لڑکے کا خیال آیا جسے تھوڑے دن ہوئے نمونیہ ہو گیا تھا۔ اور اگر کہیں اسے بھی کچھ اس قسم کی بیماری ہو گئی تو اس کا سارا "کیریر" چوپٹ ہو جائے گا۔

"مسٹر عارف! ہم کہاں جا رہے ہیں؟" چھوٹی سی، خوبصورت لڑکی نے پوچھا اور مسکرا کر عارف کی طرف دیکھا۔

یہ سوال سن کر عارف کو پورا یقین ہو گیا کہ لڑکی الّو پر ریجھ گئی وہ اس کی طرف دیکھ کر ایک فاتحانہ انداز سے مسکرائے اور انھوں نے جواب دیا "کہیں چل کر ایک ایک پیالی قہوہ کیوں نہ پیا جائے" "وہ پھر اس کے بارے میں باتیں ہوں گی!"

"دیر بہت ہو گئی ہے" لڑکی نے کچھ اس لہجہ میں جواب دیا جس میں رضامندی شامل معلوم ہوتی تھی۔

"لائنس کارنر ہاؤس دس پندرہ منٹ چل کر ہم پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں اتنی دیر

ہوئی وہاں تھوڑی اور سہی۔ چلئے بھی" عارف نے کہا۔

اور یہ کہہ کر ان دونوں نے کارنر ہاؤس کا رستہ لیا۔

عارف نے اپنے دل میں اب طرح طرح کے منصوبے باندھنے شروع کیے۔ اس نے سوچا کہ قہوہ پینے کے بعد وہ اس لڑکی کو اپنے گھر لے جائے گا۔ لیکن کیسے؟ کس طرح سے وہ اس مضمون پر اس سے باتیں شروع کرے؟ یہی تو ان معاملوں میں سب سے بڑی مشکل ہوتی ہے ابتدا ایک مرتبہ ہو جائے پھر تو ساری کارروائی سہل ہے۔ ابتدا! ابتدا! یہی سب سے اہم بات ہے!

"ہم ایک گھنٹے سے ساتھ ساتھ ہیں لیکن آپ نے مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کیا کرتی ہیں" عارف نے پوچھا۔

"کون؟ میں؟ میں کرتی کیا ہوں!" لڑکی قہقہہ مار کر ہنسی: "اکثر تو میں فاقہ کرتی ہوں۔ گو کہ میری شکل دیکھ کر کسی کو اس کا وہم و گمان تک نہ ہوگا۔"

"اس کے کیا معنی؟" عارف نے خیال کیا "کپڑے تو اتنے شاندار اور ایسی بنی ٹھنی دیکھنے میں تو لڑکی کافی خوشحال معلوم ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ فاقہ کرتی ہے!"

عارف نے اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کی کوشش کی: "مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن آپ کوئی نوکری کیوں نہیں کرتیں؟"

"ملتی ہی نہیں" لڑکی نے پھر ہنس کر کہا "میں ایکٹرس بننا چاہتی ہوں سینما ایکٹرس تین چار برس سے اسی کام میں لگی ہوئی ہوں۔ لیکن مہینہ میں چار پانچ دن کی نوکری مجھے ملتی ہے۔ اور وہ بھی بالکل چھوٹے چھوٹے معمولی پارٹس کرنے کے لئے۔ بھلا کس طرح سے میں اس میں اپنی اصلی قابلیت دکھاؤں! میرے خیال میں دنیا کے تمام پیشوں سے زیادہ فلم ایکٹنگ کا پیشہ مشکل ہے لیکن خیر مجھے کچھ پروا نہیں۔ باوجود ان مصیبتوں کے میں نے اپنی زندگی کو کافی دلچسپ بنا لیا ہے اور پھر میں یہ کہتی ہوں کہ پریشان ہونے سے فائدہ ہی کیا؟ میرے بہت سے دوست ہیں ایسے ہی میرے ایسے لوگ، اپنے نکرے، اپنے روزگار، جب ہمارے

پاس بالکل ایک پیسہ بھی نہیں رہ جاتا تو ہم رات بھر اپنے کمروں میں ناچ کر گذار دیتے ہیں
مجھے ناچنے کا بہت شوق ہے۔ اور "رمبا" تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں "رمبا"
کافی اچھا ناچ لیتی ہوں ..... آپ کو ناچنے کا شوق ہے؟ اس نے عارف سے کیا دگی پوچھا۔

"ہاں۔جی۔ مجھے ناچنے کا بہت شوق ہے ..... لیکن مجھے اس کی فرصت کم ملتی ہے۔"
عارف نے جواب دیا۔ اس لڑکی کی باتوں سے اسے کچھ خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں
آتا تھا کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح کی باتیں اس سے کرے
وہ غریب تھی۔ لیکن پھر بھی خوش، اس کے کیا معنی؟ بھوکی ہو کر ناچتی تھی یہ کیا؟

"آپ معلوم ہوتا ہے اس قسم کے لوگوں میں ہیں جو ہر وقت پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتے
ہیں! آپ کا کبھی جی نہیں گھبراتا؟ آپ اپنی چھٹیاں کیسے گذارتے ہیں؟ آپ فرصت کے وقت
آخر کیا کرتے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔ اس کے چہرے سے دراصل حیرت اور استعجاب ٹپک
رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کے نوجوان سے کبھی ملی ہی نہیں ہے۔

میں ایک بہت مشکل امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔ آئی۔سی۔ایس کا امتحان غالباً
آپ نے اس کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ ہندستان کی بہترین نوکری کا امتحان ہے ..... لیکن خیر آپ کے
ساتھ میں ناچنے ضرور چلوں گا ہفتہ میں ایک مرتبہ" عارف نے لڑکی کو خوش کر کے گفتگو کا پہلو
بدلنے کی کوشش کی۔

لیکن لڑکی نے اس طرف کچھ توجہ نہیں کی اس نے کہا "آئی۔سی۔ایس یہ کیا چیز ہے؟
..... اچھا اب میں سمجھی سول سروس! ..... یہی گورنمنٹ کے دفتروں میں نوکری! بچپن میں
جہاں میں رہتی تھی اس کے پاس ایک بڈھا سول سروس کا رہتا تھا۔ خشک، سوکھا سا انسان
..... اور اسے ہمیشہ بدہضمی کی شکایت رہتی تھی! آپ سول سروس میں کیوں جانا چاہتے ہیں
مجھے یقین ہے یہ تو بڑی غیر دلچسپ مہمل سی چیز ہے۔"
عارف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اس نے کہا کہ ہندستان میں سول سروس

بالکل دوسری چیز ہے۔ لیکن اس چھوٹی سی سینما ایکٹرس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس نے ہاں ہوں کچھ اس طرح سے کہا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دلچسپی عارف سے کم ہوتی جارہی ہے اور عارف کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ وہ اتنی دیر جاگنے کی وجہ سے تھک گیا تھا۔ اب اس کو ان باتوں سے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ کچھ اس لڑکی کی حماقت پر غصہ آرہا تھا۔ کچھ اپنی ناکامیابی پر۔ لیکن اس حسین عورت کی اتنے قریب موجودگی رہ رہ کر اس کے جذبات کو مشتعل کر دیتی تھی۔ اس لڑکی کے جسم سے عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو، چست کوٹ میں ابھرا ہوا سینہ، اور اس کے لب ذرا موٹے سے مگر دل فریب، جیسے رسیلے انگور، اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں جو رات کے اندھیرے میں اور زیادہ سیاہ معلوم ہوتی تھیں۔ عارف کو بس انھیں چیزوں کا اس وقت احساس تھا۔ اس کی گفتگو، یہ سڑک۔ غرض اس لڑکی کے نوجوان جسم کے علاوہ ہر چیز اسے فضول معلوم ہونے لگی۔

وہ چلتے چلتے برٹش میوزیم کے پیچھے آگئے، ایک طرف لندن یونیورسٹی کی نئی عمارتیں بن رہی تھیں، آدھی بنی ہوئی دیواریں، سیڑھیاں، مچانیں اور پتھر اٹھانے والے "کرین"، لکڑی کی چہار دیواری کے اندر سے اوپر اٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، اور چوڑی سی سڑک کے دوسری طرف میوزیم کے اونچے اونچے کھمبے اور نیچے چبوترے پر بیچ و بیچ میں دو پتھر کے بڑے بڑے شیر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت یہاں بالکل تنہائی تھی۔ عارف نے خیال کیا کہ اب چند منٹ میں وہ "کارنر ہاؤس" میں پہنچ جائیں گے اور وہاں پھر تنہائی کہاں اس نے ہمت کر کے اس لڑکی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ اور پھر اس کو ذرا دبایا۔ لڑکی نے اسی طرح اس کے ہاتھ کو ذرا سا دبایا۔ اب عارف کو خوشی ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ لڑکی اسے پسند نہ کرتی تو کیوں وہ اس بات کی اجازت ہی دیتی کہ وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ڈالے اور پھر یہی نہیں اس نے اس کے ہاتھ کو دبایا بھی۔ عارف سمجھا کہ اسے پوری کامیابی ہوگی۔

لیکن پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ اس سے روپے وصول کرنے کے

لئے تو یہ حرکتیں نہیں کر رہی ہے۔ اس کی گفتگو سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے عارف کچھ زیادہ پسند نہیں، پھر یہ ہاتھ دبانا کیسا؟ پھر اسے کچھ اس لڑکی کی غربت پر افسوس کیا۔ کیا حرج ہے اس نے اپنے دل میں کہا۔ اگر اس کی مالی امداد بھی کچھ ہو جائے۔ عورتوں پر تو بہر حال روپیہ خرچ ہوتا ہی ہے۔ چاہے وہ بیوی ہو یا طوائف یا اس قسم کی کوئی لڑکی۔ عارف کی ہمت اب کچھ اور بڑھی، اس نے بڑی محبت کے ساتھ لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا "تم کس قدر خوبصورت ہو!"

"سچ؟" اس نے یوں ہنس کر کہا۔ جیسے اس پر اس خوشامد کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اور قبل اس کے عارف کچھ کہہ سکے اس نے میوزیم کے شیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا "ذرا ان کو دیکھئے! آپ نے کبھی غور کیا ہے یہ شیر کتنے بڈھے معلوم ہوتے ہیں، جیسے ان کے منہ میں دانت ہی نہیں اور یہ یہاں صرف آٹھ دس برس ہوئے رکھے گئے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں، آپ کو ان سے ضرور ملنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ شیر برٹش امپیریلزم کے زوال اس کے بڑھاپے کی تصویر ہیں۔ ان کے چہرے پر وحشیانہ شان باقی نہیں رہی بلکہ سانپ کا سا زہریلا پن آگیا ہے، میرے خیال میں وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے بھی ان شیروں سے نفرت ہے آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میں نے کبھی انہیں اچھی طرح نہیں دیکھا" عارف نے گھبرا کر جواب دیا۔ ان باتوں سے اسے سخت الجھن ہونے لگی۔ پالٹیکس، پالٹیکس، جہاں جاؤ یہی تذکرہ رہتا ہے۔ اس کا دوست کوئی کمیونسٹ ہوگا۔ اسی نے یہ بے تکے خیالات اس لڑکی کے دماغ میں بھر دیئے ہیں، ورنہ اس سے اور برٹش امپیریلزم سے کیا مطلب؟ اسے ان لوگوں پر سخت غصہ آیا۔ ہر جگہ یہ لوگ گڑبڑ اور فساد پیدا کرتے ہیں۔ ایک وہ احسان صاحب ہیں جو کسی ہندوستانی طالب علم کو لندن میں چین ہی سے نہیں بیٹھنے دیتے، جو کوئی سرکاری نوکری کا خیال بھی کرے اسے غدار سمجھتے ہیں۔ گاندھی کو سرمایہ داروں کا غلام سمجھتے ہیں، جواہر لال نہرو کو یہ کمزور سمجھتے ہیں چونکہ وہ نازک موقعوں پر گاندھی ہی کی پیروی کرتا ہے، اور یہاں

ولایت میں تو یہ کسی کو اچھا سمجھتے ہی نہیں۔ بالڈون، لائڈ جارج، میکڈانالڈ، یہ سب سرمایہ داروں کے زرخرید غلام ہیں۔ اور یہ لوگ کتنے مقرر ہوتے ہیں، ایک "کمیونسٹ مینیفسٹو" پڑھ کر اپنے کو سب سے بڑا عالم فاضل خیال کرنے لگتے ہیں، ہر چیز پر طعنہ، ہر شخص کو برا بھلا کہنا، ہر بات میں برائی نکالنا یہ ہے ان کا کام۔ ان شیروں میں، آخر کون سی برائی ہے؟" لیکن عارف کو ہمت نہیں ہوئی کہ کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات کہے جو اس لڑکی کو ناگوار گذرے۔

"ہوں" لڑکی نے آہستہ سے کہا، اور گفتگو کا سلسلہ پھر بند ہو گیا۔ عارف کو اب یہ خیال ہوا کہ کسی طرح سے اس لڑکی کو خوش کرنا چاہیئے۔ اس نے "ہوں" کچھ اس لہجہ میں کہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی صحبت سے گھبرا سی گئی ہے۔

"تمہارے بال کتنے اچھے ہیں" عارف نے مسکرا کر کہا۔

"دراصل آپ کا یہ خیال ہے؟" لڑکی نے خشک لہجہ میں کہا۔ اس کے بعد کچھ خاموشی چھا گئی، عارف کو پھر گھبراہٹ ہوئی، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بس اسی جگہ اس لڑکی کو سینے سے چمٹا لے اور اس کے لبوں کا بوسہ لے۔ اس کے لب کتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے اور اس کا جسم کیا اس لئے نہیں تھا کہ اسے گود میں لیا جائے؟ بہت ممکن ہے کہ یہ لڑکی خود بھی یہی چاہتی ہو اور اس قسم کی فضول باتوں سے گھبرا رہی ہو، عارف نے تہیہ کر لیا کہ وہ ریسٹوران میں پہنچ کر قہوہ پیتے وقت ضرور اس لڑکی سے کہے گا کہ وہ اس کے ساتھ گھر چلے۔ اور پھر عارف کو یقین ہونے لگا کہ وہ ضرور راضی ہو جائیگی آخر ایکٹریس اسی قسم کی زندگی بسر کرتی ہوں گی۔

اتنے میں وہ چلتے چلتے "ٹاٹن ہم کورٹ روڈ" پر آ گئے۔ گو کہ رات زیادہ گئی تھی مگر اس چوراہے پر اس وقت بھی رونق تھی سینما کی بڑی بڑی دوکانیں اور ان کی جگمگاتی ہوئی روشنیاں، لمبے لمبے سیاہ کوٹ پہنے ہوئے "پولیس مین" ناچ گھر کے پاس کھڑا

ہوئے شرابی، کچھ لوگ موٹر بس کے رکنے کی جگہ پر کھڑے ہوئے اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے، ایک کونے میں دو تین اخبار والے کھڑے ہوئے تھے، پیدل چلنے والے تیز قدم چل رہے تھے، سردی زیادہ تھی۔

لڑکی اور عارف بالکل کارنر ہاؤس کے قریب آ گئے اور اندر داخل ہونے والے ہی تھے کہ لڑکی کی نظر ایک چھوٹے سے اخبار والے پر پڑی جو سڑک کے دوسری طرف کھڑا ہوا تھا

"میں اپنے دوست کے لئے "ڈیلی ورکر" خریدنا چاہتی ہوں ذرا معاف کیجئے گا"

اور یہ کہہ کر وہ لپک کر سڑک کے دوسری طرف گئی۔

عارف اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ اب تو اسے بالکل یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی کمیونسٹوں کی صحبت میں رہ کر خراب ہوئی ہے کیونکہ وہ جو اخبار خریدنے گئی تھی وہ انھیں لوگوں کا اخبار تھا۔ اس کے اشتہار اخبار والے کے پاس دیوار پر لگے ہوئے تھے "مجھ کے مزدوروں کا عظیم الشان جلوس" اور اس پر سرخ رنگ کا ہتھوڑے اور ہنسیا کا نشان بھی بنا ہوا تھا۔

لڑکی کے اس طرح سے یکبارگی ساتھ چھوڑ دینے پر عارف کو غصہ آیا لیکن دو منٹ بعد وہ پھر واپس آ گئی وہ سمجھ گئی کہ عارف اس سے کچھ خفا ہے۔

"معاف کیجئے گا اگر میرا ایک بہت بڑا دوست ہے جو اس اخبار کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ مجھے خود تو پالٹیکس سے زیادہ دلچسپی نہیں"

"کچھ مضائقہ نہیں" عارف نے کہا، اس نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو وہ اس لڑکی کو مزدور ان بڑے لوگوں کی صحبت سے بچا لے گا۔ وہ ابھی سے اپنی ما[illegible] سمجھنے لگا۔

اتنے میں ایک "بس" ان کے سامنے آ کر رکی، لڑکی اسے دیکھتے ہی اچھل پڑی" اسے یہ تو میری "بس" آ گئی۔ یہ تو مجھے ٹھیک میرے گھر تک پہونچا دے گی۔ آپ برا نہ

نہیں مانیں گے اگر میں ابھی چلی جاؤں! اس کے بعد پھر کوئی "بس" نہیں۔ آپ کو مجھے ٹیکسی پر گھر پہونچانا پڑتا۔ آپ کا دام بچے گا ......" اس نے یہ سب فقرے ایک سانس میں کہے اور قبل اس کے کہ عارف اس کی باتوں کا جواب دے سکے، وہ لپک کر "بس" پر سوار ہوگئی۔ "خدا حافظ!" اس نے "بس" کے زینے پر سے مسکرا کر عارف سے کہا۔

"خدا حافظ" عارف نے آہستہ سے جواب دیا۔ "بس" روانہ ہوگئی اور وہ اسی جگہ کھڑا رہ گیا۔ پشیمانی، بے بسی، اور غصے نے اس کے سارے تن بدن میں آگ لگا دی۔ آج اپنی تنہائی کا اندوہگیں احساس ہوا۔ اس لڑکی کی ہنستی ہوئی صورت بھنور کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اب دوسری عورتوں کی طرف اس کا خیال جاتا بھی نہ تھا۔ لیکن اس لڑکی سے بعد کو بھی ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس کا پتہ تک نہیں معلوم تھا اور اب تو یہ صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ وہ خود عارف کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں کرتی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اسی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ پھر ٹیکسی لے کر اپنے گھر کی طرف سدھارا۔

"تمہاری باتیں میری بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔" راؤ نے احسان سے کہا "ایک طرف تو تم ان ہندوستانی طالب علموں کی جو یہاں ہیں اتنی برائیاں کرتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ذلیل ترین مخلوق ہیں اور دوسری طرف اس بات کی بھی ان سے توقع کرتے ہو کہ وہ تمہارے ہم خیال ہو جائیں اور اپنے ذاتی فائدے کی باتوں کو چھوڑ کر اپنے ملک اور دنیا کے مسائل کو سمجھیں اور بڑی بڑی تحریکوں میں حصہ لیں۔ میرے خیال میں یہ حماقت ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ بالکل بیکار سی چیز ہیں۔ ہمارے ذہن میں اب کسی جدت کی طاقت باقی نہیں رہی، ہم ایک راستہ پر لگا دیئے جاتے ہیں، اسی پر چلنا فخر سمجھتے ہیں۔ دماغی اور روحانی موت اسی چیز کا نام ہے۔ کسی ایسی ذہنیت کو ان لوگوں میں ڈھونڈنا جس میں تازگی ہو یا سچائی کے بوجھ کو برداشت کرنے کی طاقت ہو، فضول کوشش ہوگی۔"

راؤ اور احسان، نعیم الدین کے گھر سے نکل کر پیدل ہی اپنے گھر جا رہے تھے۔ وہ دونوں ایک مکان میں رہتے تھے۔

"تمہاری منطق ہمیشہ تمہیں ایسی محفوظ جگہ پہونچا دیتی ہے جہاں بیکاری اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ہی سب سے ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔" احسان نے جواب دیا۔

"یہاں کے ہندستانی طالب علم، ہندستان کے امیر طبقہ کے نوجوان نمائندے ہیں۔ اور یہ طبقہ ضرور ایسا ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب بحیثیت مجموعی اس میں کوئی بھلائی باقی نہیں رہی۔ بڑے بڑے راجاؤں، نوابوں اور رئیسوں کو لے لو۔ ان کی ذات سے کسی کو کیا فائدہ پہونچتا ہے؟ ان مفت خوروں کو اس بات کا بھی تو سلیقہ نہیں کہ اپنی دولت اپنے ہی اوپر ٹھکانے سے خرچ کریں۔ یہ تو عیاشی بھی کرتے ہیں تو بدتمیزی کے ساتھ بھونڈے پن سے، دماغ کی جگہ ان کے سر میں گوبر بھرا رہتا ہے۔ صرف ایک کام ان کو خوب آتا ہے۔ ملک فروشی، اور اس مبارک کام کے لئے یہ بڑی بڑی قربانیاں تک کر سکتے ہیں رہ گئے متوسط طبقے کے لوگ ان میں بہتیرے تو ایسے ہیں جو انھیں رئیسوں کے طفیل سے زندہ ہیں، مثلاً، وکیل بیرسٹر یا ایسے لوگ جو سرکاری نوکر ہیں یا بڑے بڑے پونجی پتی اپنا سرمایہ دار سمجھ تو ان لوگوں میں ضرور ہوتی ہے، لیکن ان لوگوں کے نزدیک اس کا مصرف صرف روپیہ جمع کرنا ہے۔ جیسے ایک بازاری عورت روپیہ کے لئے اپنا بدن بیچ دیتی ہے یہ لوگ اسی طرح سے اپنی ذہنی طاقت کا بیوپار کرتے ہیں یوں تو ان لوگوں میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں لیکن میرے خیال میں ان میں خاص صفت ان کا بودا پن ہے۔ جس طرح پرانے زمانے میں انسان اپنی جہالت کی وجہ سے ہر ہر درخت ہر ہر پتھر میں خوفناک بھوتوں کو چھپا پاتے تھے اسی طرح سے یہ لوگ چاروں طرف سے اپنے کو دشمنوں کے نرغے میں گھرا پاتے ہیں، گورنمنٹ کا ڈر، راجاؤں مہاراجاؤں کا ڈر، مذہب کا ڈر، ملا کا ڈر، برہمن کا ڈر، ایک طرف۔ سرکاری نوکر ہے تو اپنے افسر کے سامنے ایسا مسکین بنا رہتا ہے۔ جیسے اپنے مالک کے سامنے دُم دبائے

ہوئے کوئی تمنّا ہو؟ اور اپنے سے نیچے درجے والوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے جس میں انسانیت کہیں چھو کر بھی نہیں جاتی، ڈانٹ ڈپٹ، گھڑکی سے کم تو بات ہی کبھی نہیں کرتا۔ و بنیے مہاجن، سوداگر یا سرمایہ دار تو سب کی یہی تمنّا رہتی ہے کہ کسی طرح سے اس کے اور ساتھی مٹ جائیں، تباہ ہو جائیں اور ان کی ساری دولت سمٹ کر اس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے، اور دوسری طرف ان تمام لوگوں کو اپنے سے نیچے طبقوں والوں کا ڈر لگا رہتا ہے کہیں مزدور ان کے لئے مزدوری کرنا نہ چھوڑ دیں۔ کہیں کسان یہ نہ کہنے لگے کہ زمین اس کی ہے جو اس کو جوتتا ہے۔ کہیں کایا پلٹ نہ ہو جائے! یہ لوگ بار بار اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ ہندوستان روس نہیں ہے، لیکن اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی طاقت انھیں اب تو ایک دم بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، ہر ترقی پسند تحریک میں انھیں اشتراکیت کا بھوت دکھائی دیتا ہے انھیں لوگوں کے لڑکے ولایت تعلیم کے لئے آتے ہیں، اُن سے بھلا ہمیں کیا امید ہو سکتی ہے!"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں! پھر تم کیوں خفا ہوتے ہو؟" راؤ نے پوچھا

"اس وجہ سے کہ صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے!" احسان نے تیزی سے جواب دیا "تم کیا روزانہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ انھیں طبقوں سے نکلے ہوئے افراد اپنی ذات کے اور اپنے خاص گروہ کے فائدہ کو بھلا کر ہندوستان کے مظلوم انسان کی حمایت ہی صرف نہیں کرتے بلکہ بالکل ان میں مل جاتے ہیں اور اپنے طبقے کی بزدلانہ ذہنیت کو مطلقاً چھوڑ کر ایک ایسی انقلابی ذہنیت میں ڈوب جاتے ہیں، جو ان میں آہنی ارادے، فولادی طاقت پیدا کر دیتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چند اشخاص اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں کہ تاریخی حیثیت سے وہ امیر طبقہ جس میں کہ وہ پیدا ہوئے تھے اب اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے۔ اس کی موت کا پروانہ مل چکا ہے کیونکہ اب اس کا وجود نسل انسانی کی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ لیکن یہ تبدیلی، یہ سمجھ یکبارگی کسی میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ

برسوں کی دماغی اور جسمانی مشقت کا نتیجہ ہوتی ہے، مزدور کی سمجھ میں تو یہ بات آسانی سے آجاتی ہے کہ اس کی محنت کا پھل اسی کو ملنا چاہیئے، مگر امیر آدمی کی سمجھ میں اس بات کا آنا بہت مشکل ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی بڑی پیچیدہ بات ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں اُس کا نقصان ہے۔ لیکن اس گروہ کے وہ اِکّے دُکّے لوگ جو محنت و مزدوری کرنے والوں کے انقلابی نظریوں کو قبول کرکے اس پر عمل کرنے کے لئے بھی آمادہ ہوتے ہیں زیادہ تر طالبعلموں ہی کے طبقہ میں نکلتے ہیں۔ کیا یہ بہت بڑی غلطی نہ ہوگی اگر ہم اس بات کی کوشش بھی نہ کریں کہ ہم ان طالبعلموں کو جو ہمارے نئے خیالات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ جن کے دل مردہ نہیں ہوچکے ہیں اور جن کے دماغ معطل نہیں اور جن کے جسم کام کرنے سے نہیں مرجھا گئے، ہم اُن کو اس راستہ کی طرف لانے میں مدد دیں جدھر زندگی کی روشنی ہے، جدھر تکلیف اور مصیبت اور مشکل تو ضرور ہے، لیکن موت کا گھٹاٹوپ اندھیرا نہیں جدھر ہر بیہودہ بے حسی کا نام خوشی نہیں بلکہ جدھر مسرت کا ایک نیا احساس ہے۔ قدرت کی اندھی طاقتوں کو زیر کرنے کی مسرت، انسانوں کو بے شعوری بدنظمی، اور خودغرضی کی بربریت سے نکال کر ایک منظم مہذب اور متمدن دنیا بنانے کی مسرت کام کی مسرت محنت اور مشقت کی مسرت۔"

احسان چپ ہوگیا۔ راؤ نے اس کی باتوں کا کچھ جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں خاموشی کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر راؤ نے آہستہ سے کہا "تم کہتے تو ٹھیک ہو۔ لیکن کیا کیا جائے، یہ لوگ تمہاری باتیں تک سننا گوارا نہیں کرتے۔ پھر کیسے ان کے خیالات میں تبدیلی کرسکتے ہو؟ یہ طالب علم تو صرف نوکری اور روزگار کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور چند جو تمہاری باتیں سنتے بھی ہیں وہ میری طرح کے ہیں۔ سُنا، سمجھے، اور پھر بھول گئے، یا بہت کیا تو لال ٹائی لگا کر کسی سوشلسٹ میٹنگ میں چلے گئے اور ایک دو کتابیں اسی مضمون پر لے کر پڑھ لیں۔ لیکن ان کی طرزِ زندگی میں بالکل کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے؟

ہے ؟ کبھی کبھی میرے دل میں یہ سوال اٹھتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے کہ میں تمہارے خیالات سے ہمدردی تو کرتا ہوں مگر کبھی تمہارے ساتھ ہو کر باقاعدہ کوئی کام نہیں کرتا ؟ ایک عجیب طرح کی ذہنی تساہلی سی ہے جو ہم پر چھائی رہتی ہے، جیسے تپ دق جسم کو ہلکی ہلکی آگ میں جلا کر آخر کار اسے بالکل خاک کر دیتا ہے، اسی طرح میں سمجھتا ہوں آتما کا بھی ایک روگ ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ ہماری روح کو بے حس کر کے اسے بالکل مردہ کر دیتا ہے ۔"

"خیر یہی بہت ہے کہ تمہیں احساس تو ہے کہ اس قسم کی کوئی بیماری ہوتی بھی ہے، نفرت کے قابل تو وہ لوگ ہیں جنھیں اس کا احساس تک نہیں ۔"

"ان لوگوں میں یہی احساس باقی ہوتا تو پھر ہم انھیں مردہ ہی کیوں کہتے ؟"

(۴)

اعظم نے اپنے کمرے میں پہنچ کر گیس جلائی، ٹوپی اتار کر پلنگ پر پھینکی اور بغیر اوور کوٹ اتارے آتشدان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے کوئی چیز اچھی طرح دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک طرف دیوار پر کتابوں کی چھوٹی سی الماری، اس کے نیچے میز ایک دو کرسیاں، کونے میں پلنگ، کمرا بالکل چھوٹا سا تھا اور میز کرسی اسباب سے بالکل بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اس تاریکی میں اعظم کو ان گلیوں کا خیال آیا۔ ہندستان کے شہروں کی گلیاں، دلی، لکھنؤ، بنارس جن میں رات کو بالکل تاریکی رہتی ہے یا جہاں روشنی بہت کم ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ وہ بڑی رات گئے اپنے ایک دوست کے ساتھ چوک جا رہا تھا۔ بالکل اندھیرا تھا۔ نالیوں میں سے بو آرہی تھی۔ چلتے چلتے ایک طرف روشنی دکھائی دی جو ایک کوٹھری کے دروازے میں سے آرہی تھی۔ ادھر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ دو بڈھے ایک تخت پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے جسم پر سوائے چھوٹی چھوٹی تہمدوں کے اور کچھ

بھی نہیں۔ سفید داڑھیاں، گردنیں جھکی ہوئی اور ان کے سامنے شطرنج بچھی ہوئی ہے معلوم ہوتا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں صرف یہ دو بڈھے اس وقت جاگ رہے تھے۔ اور ان کی لالٹین کے سوا شہر کی باقی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ اعظم اور اس کا دوست ذرا دیر کے لئے وہاں رُک گئے لیکن اُن دو بڈھوں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس وقت اعظم کو ان دونوں کا خیال کرکے کچھ خوشی ہوئی یہ کس بات کی خوشی تھی؟ ایک پرانی یاد جس پر وقت کی منوں خاک پڑی ہوئی تھی، اس وقت کیوں اس کے ذہن میں جاگ اٹھی؟ پھر اسے اپنے دوست کا خیال آیا جو اس کے ساتھ تھا۔ اسے تین برس سے اس کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ بی، اے پاس کرنے کے بعد اس نے نوکری کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کا نام تھا بشمبھر۔ اس کی شادی تو اس وقت ہو گئی تھی۔ اب اس کے بچے بھی ہوں گے شاید دیہات میں کہیں وہ رہتا ہوگا۔ اس کے پاس ایل ایل۔ بی تک پڑھنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ بشمبھر کے بیوی اور بچے ضرور تکلیف میں ہوں گے۔ آج کل بیروزگاری کتنی بڑھتی جا رہی ہے! اس کا انجام کیا ہوگا؟ میرا انجام کیا ہوگا؟ میں اپنے امتحان میں بھی پاس ہوں گا یا نہیں؟ اور اگر ہو بھی گیا تو پھر اس کے بعد نوکری بھی ملے گی یا نہیں اور جو لوگ گولی سے مارے گئے اُن کے بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا؟

اعظم کو اپنی چھوٹی بہن کا خیال آیا جس کا سن کوئی بارہ برس کا تھا۔ اس ہفتہ گھر سے اس کا خط آیا تھا۔ جس میں لکھا تھا "ہم سب کو آپ کے آنے کا بڑا انتظار ہے۔ اب جلدی سے آجائیے، امّی بھی ہر وقت آپکی کامیابی کی دعا کیا کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ کے لئے انھوں نے بڑی اچھّی سی دلہن چنی ہے ....." اس خط کو پڑھ کر بھی اسے گھر جانے کی بالکل خواہش نہیں ہوئی۔ اپنے بوڑھے ماں باپ، اپنے چھوٹے چھوٹے بھائیوں سے ملنا تو وہ ضرور چاہتا تھا لیکن اس کے دل میں امتحان میں کامیاب ہو کر جلدی سے گھر واپس جانے کی وہ امنگ جو شروع شروع میں تھی اب باقی نہیں رہی "امّی نے میرے

لیے اچھی سی دُلہن چُنی ہے!" اسے اس خیال پر ہنسی آ گئی "کیوں نہیں؟ آخر ہندستان ہی میں کیا تمام دنیا میں سیکڑوں برس سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ چیز یہاں یا فرانس کے لئے ہے میں بھی وہی کیوں نہ کروں جو سب کرتے ہیں۔ لیکن محبت؟ عشق؟ اس کی بھی کوئی جگہ ہمارے تمدن میں ہے؟" اس کا خیال پھر آج شام کے واقعات کی طرف گیا۔ اور پھر اسے اپنی محبت کی ابتدا یاد آئی۔

"کیا اسی چیز کا نام محبت ہے؟ پہلے روز جب وہ جین سے ملا تھا؛ وہ ان دونوں نے ایک ساتھ دعوت میں کھانا کھایا تھا؛ وہاں پندرہ بیس آدمی مرد اور عورتیں اور بھی تھے لیکن ان کی نظروں میں بس یہی ایک لڑکی سما گئی تھی، پھر اس کے کئی دن بعد جب وہ پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی یہی کمرہ تھا۔ اسی کرسی پر وہ بیٹھی تھی پھر میں نے اسے اپنی گود میں لے کر پیار کیا تھا؟ اس کے بعد اسے اور دن اور راتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کوشش کی کہ وہ کسی دوسری بات کا خیال کرے۔ گزشتہ خوشیوں کی یاد بہت تکلیف دہ ہو سکتی ہے

وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کی۔ اس کی نظر آئینے پر پڑی، قد آدم آئینہ جو الماری کے پٹ پر لگا ہوا تھا اس نے اپنی صورت پر نظر ڈالی "اس کی داڑھی ذرا بڑھ آئی تھی اور اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے وہ آئینہ کی طرف سے مڑ گیا اور اس نے کپڑے اُتارنے شروع کیے۔

"اگر جین اس وقت میرے ساتھ آ گئی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ توبہ توبہ کوشش بھی کرتا ہوں پھر بھی اس کا خیال آ ہی جاتا ہے۔ آج وہ کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی لیکن مجھ کیا۔ سچ کیا۔ اور یہ زندگی کتنی دوبھر معلوم ہو رہی ہے! کسی طرح سے میری طبیعت کسی اور طرف مائل ہو جاتی۔ پیرس، لوگ کہتے ہیں کہ انسان پیرس میں دنیا کے سب غم غلط کر سکتا ہے! غلط، غلطی، اتفاق۔ غلطی اور اتفاق یہی وہ راستے ہمیشہ مصیبت اور رنج کی منزل تک پہونچاتے ہیں۔ مگر میں کہاں جانا چاہتا ہوں؟"

اس نے شب خوابی کے کپڑے پہن لئے۔ اسے تھکاوٹ معلوم ہو رہی تھی! اس نے ایک انگڑائی لی، بجلی کی روشنی بند کی اور کود کر بستر میں گھس گیا۔ چادر اسے برف کی طرح ٹھنڈی معلوم ہوئی۔ وہ سردی سے کانپنے لگا۔ لیکن ذرا دیر میں بستر گرم ہو گیا اور اس نے پیروں کو پھیلا کر کروٹ بدلی "آج شام کو رسل اسکوائر کے اسٹیشن پہ مجھے کتنی سردی کھانی پڑی۔ اور ذلت بھی میری ہوئی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ داؤ مجھے ملا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو کیا ہوتا؟ جین، آج میں اس کے ساتھ ناچا تو ضرور مگر وہ خوشی جو مجھے شروع شروع میں اس سے ملنے سے ہوئی تھی نہیں ہوئی، خوشی؟ اصلی بہشت وہ ہے جسے ہم کھو چکے۔ یہ کس کا قول ہے؟ فرانسیسی ناول نویس۔ ارادہ، کوشش، سمجھداری، جدوجہد یہ سب محض الفاظ ہیں اس طرح کے جن کا تعلق مستقبل سے ہے اور اس لئے فضول ہیں۔ لیکن گزشتہ کی یاد بھی کچھ مسرت نہیں پہونچاتی، یادیں کیا ہیں؟ اصلیت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں خوشی کا ایک موقع اور پھر تھوڑے دنوں بعد اس کی یاد۔ دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ پھر بھی ایک ہیں۔ اکیلا ہونا بھی اس دنیا میں کتنا برا ہے، کاش کہ جین اس وقت میرے ساتھ ہوتی، آخر کیوں چلی گئی؟ پیرس، اگر اس وقت میں وہاں ہوتا تو اچھا ہوتا وہی عورتیں جو اس مرتبہ دیکھی تھیں ہوتیں۔ میں بھی اس زمانہ میں کیا احمق تھا۔ سو فرانک بالکل مفت میں خرچ کر ڈالے، بالکل برہنہ عورتیں۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے سینہ پر رکھ لیا تھا۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آیا۔ تاریک گلی سی تھی اور دروازہ پہ سرخ لمپ لگا ہوا تھا۔ داؤ کہتا ہے کہ فرانس مفت میں بدنام ہے۔ برائی کہاں نہیں۔ فرانسیسیوں میں یاں ریاکاری اوروں سے کم ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم ......

"جین تم یہاں کہاں؟ تم اور پیرس؟ آج تمہیں میرے پاس آنے کی چھٹی کیسے مل گئی؟ کیا میری امی جان کے ڈر کی وجہ سے تم میرے پاس نہیں آتی تھیں؟ بیوقوف لڑکی! میرے پاس بہت روپے ہیں۔ میں اپنے والدین کا محتاج نہیں۔ تم نے کپڑے

کیوں اتار ڈالے؟ تمہیں سردی نہیں لگتی؟ اور شطرنج کھیلو گی میرے ساتھ۔ یہ باجہ کتنے زوروں میں بج رہا ہے۔ مجھے پسند نہیں۔ اب تم واپس تو نہ جاؤ گی...... یہیں رک جاؤ۔ اب کبھی میرے پاس سے نہ جانا........ یہ میری چھوٹی بہن ہے اس سے تو مل لو.........‘‘

۷

شیلا اور نعیم کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ جھوٹے گلاس، خالی بوتلیں، پیئے ہوئے سگرٹ کے ٹکڑے اور خاک سے بھری ہوئی خاکدانیاں، رکابیاں، بعض خالی اور بعض میں روٹی اور بسکٹ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ادھر ادھر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ گراموفون بجنا بند ہو گیا تھا مگر وہ بھی ایک میز پر کھلا رکھا تھا اس کے چاروں طرف میز اور کرسی پر ریکارڈ بکھرے پڑے تھے۔ آتشدان میں آگ قریب قریب بجھنے والی تھی۔ کمرے میں سگرٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا اور ہوا بھاری معلوم ہوتی تھی۔

نعیم نے شیلا سے کہا "آپ تشریف رکھیے۔" شیلا کھڑکی کے پاس تھی۔ نعیم بھی اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا تو یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ان پردوں کو کھسکا کر کھڑکیوں کو کھول دیجیے۔ اس کمرے میں تازی ہوا کی ضرورت ہے۔"

نعیم نے کھڑکیاں کھول دیں اور نیچے سڑک پر ایک نظر ڈالی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے ذرا دیر کے لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔ شیلا بھی اس کے قریب آ کر باہر

چھا نکلنے لگی، آسمان صاف ہو چلا تھا اور سامنے کے مکانوں کے چھت کے اوپر سے آدھا چاند دکھائی دے رہا تھا۔ زرد سا چاند جس کی روشنی زمین تک آتے آتے غائب ہو جاتی تھی۔

شیلا نے کہا "لندن میں چاند کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں چاند تو دکھائی دیتا ہے، مگر چاندنی کبھی نہیں ہوتی۔"

نسیم نے کچھ جواب نہیں دیا، اتنے میں نیچے سڑک پر ایک ٹیکسی گذری اور سامنے کے مکان کے سامنے آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک عورت اور ایک مرد باہر نکلے، انھوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا کر لبوں کا بوسہ لیا اس کے بعد عورت دوڑ کر مکان کے اندر چلی گئی اور مرد ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا، سڑک پر پھر خاموشی چھا گئی، شیلا اور نسیم کھڑکی سے ہٹ کر آتشدان کے قریب آگئے۔ نسیم ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شیلا آگ کے پاس کھڑی رہی۔

"مجھے اب گھر جانا چاہیئے" شیلا نے کہا۔

"بیٹھئے ذرا دیر تو بیٹھئے" نسیم نے کچھ سختی۔ کچھ لجاجت سے کہا۔

"شیلا کچھ نہیں بولی، اس کے چہرہ سے تردد کا پتہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھ گئی تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "آج کی پارٹی بھی کیا پارٹی تھی۔"

"امید ہے کہ آپ کی طبیعت نہ گھبرائی ہو گی عجیب عجیب قسم کے آدمی جمع تھے۔"

"جی نہیں۔ میری طبیعت تو بالکل نہیں گھبرائی، بلکہ آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن اب میں کچھ تھک سی گئی ہوں، دیر تو بہت ہو گئی ہے۔"

"آپ دل میں کہتی ہوں گی کہ آخر میں نے کیوں آپ کو اصرار کر کے روک لیا ہے۔ سب چلے گئے اور آپ کو بھی اب نیند آتی ہو گی لیکن معلوم نہیں کیوں میری نہ صرف نیند ہی اڑ گئی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میرے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا ہے جس طرح ہمارے یہاں ہندستان میں برسات میں طوفان آتا ہے۔ کالی کالی گھٹائیں جب گھر آتی ہیں، دن رات کو اور اندھیری کر دیتی ہیں اور اس اندھیرے میں بار بار بجلی چمک جب

اٹھتی ہے اور آسمان اس سرے سے اس سرے تک کانپ اٹھتا ہے۔" نعیم چپ ہو گیا اور اس نے سر اٹھا کر شیلا کی طرف دیکھا۔

"نعیم براہِ مہربانی مجھ سے اس قسم کی باتیں مت کرو۔" شیلا کا چہرہ اس وقت غم کی تصویر معلوم ہو رہا تھا۔

"کیوں؟"

"اس وجہ سے کہ تم مجھے بہت اچھے معلوم ہوتے ہو مگر مجھے کسی اور سے محبت ہے" اس نے بڑی دھیمی آواز میں اپنی گفتگو کو جاری رکھا "وہ بھی ایک ہندوستانی طالب علم تھا اور ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی۔"

نعیم کے دل میں عجیب ہیجان بپا تھا۔ محبت، ہمدردی، رشک کے جذبات اتنے اتنا زیادہ پریشان کر رہے تھے کہ وہ مبہوت سا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنے کو بھول جائے۔ کسی طرح اپنی خواہشوں ناامیدیوں اور غم کے طوفان سے بچے۔

"وہ تھا کون؟ تم اس سے کب ملیں؟ اور اب وہ کہاں ہے؟" نعیم نے شیلا سے بیساختہ پوچھا۔

شیلا نے نعیم کی طرف دیکھا۔ پھر وہ کرسی پر لیٹ سی گئی۔ "یا خدا! میں پاگل تو نہیں ہو جاؤنگی! ڈیڑھ برس ہو گئے! پہلے خط آتے تھے اب وہ بھی نہیں۔ اور اب دنیا میں کوئی شخص بھی نہیں جس سے میں اس کے بارے میں باتیں کر سکوں ..... تم پوچھتے ہو وہ کون تھا؟ ..... سنو یہ کئی سال کا واقعہ ہے سوئزرلینڈ کے پہاڑوں میں ایک نیلی جھیل کے کنارے چھوٹی سی بستی تھی جس میں کل ملا جلا کر کوئی پچیس تیس گھر رہے ہوں گے، کیا میں اسے بھول سکتی ہوں؟ گرمیوں کے دن تھے جولائی کا مہینہ اور کتنا خوشگوار موسم تھا۔ دھوپ چاندنی سی نکلی ہوئی تھی۔ اور آسمان گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ بادل کے چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح آہستہ آہستہ اڑ رہے تھے۔ دور کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر

برف سفید دودھ کی طرح چمک رہی تھی۔ کہیں کہیں بادل کے ٹکڑوں نے جو سفید بھیڑ کے گلوں کی طرح پہاڑوں کے دامن سے چپکے ہوئے تھے برف کو چھپا لیا تھا۔ اونچی اونچی پیڑیوں کے نیچے گہری وادیاں دکھائی دے رہی تھیں جن پر سایہ چھایا ہوا تھا......

"میں ایک کافی کے سائبان میں اکیلی بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ قریب ہی ایک ہندوستانی لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، پھر ان دل کش پہاڑوں اور اُن پر دھوپ چھاؤں کے نظّاروں کی طرف دیکھنے لگی۔ دو منٹ بعد وہ اٹھ کر چلا گیا، ہاں جاتے وقت مجھ پر بھی اس نے ایک نظر ڈالی۔ میں نے اپنا رُخ دوسری طرف کر لیا۔ ہماری پہلی ملاقات! یہ اتفاق ہماری زندگی میں کیسے ہوتے ہیں؟ اور پھر ان کی وجہ سے ہماری زندگی کی رفتار اور رُخ کیوں بدل جاتے ہیں؟ اس کے بعد دو دن گذر گئے اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صرف اس کے گھنے سیاہ بال، بڑی آنکھیں، پتلے ہونٹ اور چھوٹی سی ناک اور اس کے چہرہ کا وہ رنگ، دھوپ میں جلا ہوا تانبہ کا سا، یہ میرے دماغ میں کبھی کبھی چکر لگا جاتے۔ ایک دھندلی سی یاد جو کبھی کبھی چمک اٹھے اور بس۔ تیسرے دن میں جھیل کے کنارے گھوم رہی تھی۔ یکبارگی میں نے اسے آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور گردن ہلائی۔ کیا مجھے اس نے سلام کیا؟ میں گھبرا گئی۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا میرے پاس سے نکل گیا اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے سخت بدتمیزی کی۔ اسی وجہ سے ہندوستانی ہم سے نفرت کرتے ہیں اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے بجائے سلام کرنے کے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ میں سوچنے لگی کہ کس طرح اس کی تلافی کروں؟ اتنی چھوٹی بات ہے اگر اس سے ملاقات ہوا اور میں اس سے معافی مانگوں تب بھی بُرا معلوم ہوگا گھبراہٹ میں انسان سے کیسی کیسی حماقتیں ہو جاتی ہیں اور اب وہ مجھ سے ذرا سی بات کی وجہ سے نفرت کرنے لگے گا!

"اسی دن شام کو میں نے اسے پھر دیکھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں اپنے چھوٹے سے

ہوٹل سے نکل کر اکیلی برف کے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا اور آسمان کی سو رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ سفید برف پر بھی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے قریب کوئی شخص آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے مڑ کر ایک نظر ڈالی۔ وہی لڑکا کیا ابھی تک مجھ سے خفا تو نہیں ؟

تھوڑی دیر بعد میں نے کہا "کتنا اچھا منظر ہے"

"ہاں کتنا اچھا منظر ہے" اس نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس جواب کا کیا مطلب نکالوں کہیں وہ میرا مذاق تو نہیں کر رہا تھا؟ کہیں اس نے طنزیہ تو میرے ہی فقرے کو نہیں دہرا دیا یا شاید اس نے اپنی اصلی رائے کا اظہار کیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے خفا نہیں۔ شاید وہ دن کی بات بھول گیا تھا ......

"آپ اسی ہوٹل میں رہتی ہیں نا؟ میں آپ کو کئی دن سے دیکھ رہا ہوں اس نے مجھ سے کہا۔

میں خوش ہو گئی۔ مجھے اس کے انگریزی لہجہ پر کچھ ہنسی آئی۔

"جی ہاں! میں تین دن سے یہاں ٹھہری ہوں میں نے بھی آپ کو کئی بار ادھر ادھر دیکھا تھا" میں نے جواب دیا۔

"اس کے بعد ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم یوں باتیں کرنے لگے جیسے کہ ایک دوسرے کو مدتوں سے جانتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لندن میں ڈاکٹری پڑھتا ہے اور یہ اس کی پڑھائی کا آخری سال ہے آئندہ سال وہ گھر واپس چلا جائے گا وہ سوئزرلینڈ کے اس چھوٹے سے گاؤں میں ایک مہینہ کے لئے آیا ہے وہ بنگال کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام پال ہے۔ ہیرن پال۔ میں نے بھی اس کو اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں بھی سوئزرلینڈ میں چھٹیاں گذارنے کے لئے آئی ہوں۔

رات کو میں ایک قہوہ خانے میں گئی، ہمارے گاؤں کا قہوہ خانہ ایسٹوران ناچ گھر

سب کچھ وہی تھا۔ ایک لمبا سا نیچی چھت کا کمرہ، جس کی لکڑی کی چھت اور لکڑی کے فرش سے خوشگوار خوشبو سی آتی تھی، چاروں طرف میزیں پڑی ہوئی تھیں، اُن کے گرد تین تین چار چار کرسیاں، اور ایک طرف ذرا سے اونچے حصّہ پر ایک پیانو، اور ایک ڈھول اور ایک وایولن بجانے والا۔ باجہ بج رہا تھا اِدھر اُدھر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام یورپ کی زبانیں وہاں سُننے میں آ رہی تھیں مجمع بہت تھا۔ قریب قریب تمام جگہیں بھری ہوئی تھیں ایک کونہ میں جگہ خالی تھی وہاں جا کر میں بیٹھ گئی اور قہوہ پینے لگی۔

"تھوڑی دیر بعد ہیرن کو میں نے داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے اِدھر اُدھر جگہ ڈھونڈنے کے لیئے نظر ڈالی۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں بھی اس وقت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہماری نظریں ملیں اور وہ فوراً میری میز کے قریب آیا اور بغیر اجازت مانگے ایک کرسی کھینچ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"اس کی یہ بے تکلفی مجھے بری معلوم ہوئی یا نہیں۔ اس کا مجھے آج تک پتہ نہیں لیکن جب اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُسے اتنا نزدیک پایا تو میں تہذیب کے ان چھوٹے چھوٹے اصولوں کو بھول سی گئی ہم وہاں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وقت تیزی سے گذر گیا۔ بہت تیزی سے۔ ہماری میز سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ لال منہ، چھوٹی چھوٹی باریک مونچھیں، اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے ایک ہندوستانی لڑکے کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ کر جامہ سے باہر ہوا جا رہا ہے لیکن میں نے اس کی بالکل پروا نہیں کی۔ ہیرن نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

"اس رات مجھ سے ہیرن سے کیا باتیں ہوئیں مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید دُنیا کا کوئی مضمون ایسا نہ رہا ہو جس پر ہم نے بحث نہ کی ہو۔ مجھے صرف یہ خوب یاد ہے کہ میں نے دو ایک ایسی باتیں کی تھیں جنہیں کہہ کر مجھے خود بعد کو شرم آئی۔ لیکن میں بے سوچے سمجھے بولتی جاتی تھی، ہیرن بار بار مجھ سے سوال کرتا، میرے جوابوں کا جواب دیتا، کبھی مجھ پر

ہنستا۔ کبھی میری غلطی صحیح کرتا، کبھی کبھی میں اگر اس سے متفق ہوتی تو صرف اس کا جواب سننے کے لئے میں اسے بیچ میں ٹوک دیتی، یا اس کی باتوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتی، فوراً اس کی بھویں تن کر اوپر اٹھ جاتیں، اس کی آنکھوں میں بجلی سی چمک آجاتی، اس کی آواز میں تیزی، گرمی، انہماک آجاتا، جب وہ یوں بولتا تھا تو میں مشکل سے اس کی باتوں کو سنتی تھی۔ میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہ جاتی! وہ بھی بات کرتے کرتے رک جاتا اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا۔

"اس دن رات کو میں پلنگ پر لیٹے لیٹے دیر تک اس "گفتگو" کے مزے لیا کی۔ بار بار ہیرن کی آواز میرے کانوں میں آجاتی، اور اس کی ہنسی، اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک، اس کی مسکراہٹ میری آنکھوں کے سامنے پھرتی۔ میرا دل عجیب قسم کی مسرت سے بھرا ہوا تھا۔

"اس کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ ٹہلنے جاتے، ایک ساتھ ٹینس کھیلتے، جھیل میں نہاتے اور ساتھ ساتھ کھانا کھاتے۔ ہیرن اور میں دونوں اس گاؤں میں کسی اور کو نہیں جانتے تھے، ہر وقت کے اس طرح کے ساتھ سے ہم دونوں ایک دوسرے کو یوں جان گئے جس میں لوگوں کو عام طور سے مہینوں لگ جاتے ہیں۔

"مجھے اس کی ہر بات پسند آنے لگی۔ میں نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ اس سے زیادہ اچھے آدمی سے آج تک نہیں ملی۔ میری نظروں میں وہ سب سے زیادہ دلچسپ، دل کش، قابل پسند انسان تھا۔ مجھے یاد ہے انھیں خیالات کا اظہار میں نے ایک خط میں کیا تھا۔ جو انہیں دنوں میں نے اپنی دوست ڈورس کو لکھا تھا۔ اور اس نے جواب میں لکھا تھا "شیلا! تم عشق میں مبتلا ہو گئیں، خبردار! یہ موسم سرما ہے اور اس زمانے میں جوانی کا خون کبھی کبھی سر پر چڑھ کر ہمیں پاگل بنا دیتا ہے۔ میں تم کو "پاگل" ہونے سے نہیں روکتی، یہ تمہارا حق ہے لیکن یہ مت بھولنا کہ تمہارا "جنون" ممکن ہے دیرپا ہو، ممکن ہے وہ تمہاری تمام زندگی کو بنا دے یا بگاڑ دے ......"

"ڈورس کا خط پڑھنے کے بعد بار بار میں نے خود سے سوال کیا" کیا یہ سچ ہے کہ میرا دل اس لڑکے پر آ گیا؟ اسے میں پسند کرتی ہوں، اس سے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں، اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، لیکن عشق، محبت؟ کیا اسی کو عشق کہتے ہیں؟ کیا یہی محبت ہے؟ وہ دن بھی کیسے تھے مجھے کسی چیز کی فکر نہیں تھی، میری اپنی ایک دُنیا سب سے الگ تھی اور اس جادو کے حلقہ سے نکلنے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا تھا۔

" پھر وہ رات جب میں اس کے کمرے میں بیٹھی ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی! کافی گرمی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ باہر بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی بجلی کی روشنیاں سڑک پر پتیوں کی آڑ میں دکھائی دے رہی تھیں، درختوں کے خاموش و بلند خاکے پہاڑوں پر نظر آ رہے تھے اور پہاڑ خود ایک سایا ہی کا انبار معلوم ہوتے تھے۔ مگر آسمان بالکل صاف تھا اور اس پر سینکڑوں ہزاروں ستارے جگمگا رہے تھے۔"

شیلا چپ ہو گئی۔ نعیم بھی کچھ نہیں بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ "میں کہوں کیا؟ انسان کی قسمت میں یہ جگر خراشی، یہ کودنت، آخر کیوں لکھی ہے؟ بس کردں کیا؟ ہم کتنے بے بس ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ روحانی مصیبت ہے؟ جو ہمیں لاچار کر دے، جس کے سامنے ساری تدبیروں اور کوششوں کے دروازے بند ہو جائیں، جو ہمارے جذبات کو اتنا زیادہ الجھا دے کہ پھر ان کا سلجھنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے ......"

شیلا اپنی کرسی پر یوں پڑی تھی جیسے وہ سو گئی ہو، نعیم اپنی جگہ سے بیساختہ اٹھا اور شیلا کی کرسی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا وہ اس کی طرف گردن جھکائے دیکھتا رہا۔ شیلا ساکت پڑی رہی۔ نعیم جلدی سے ہٹ کر اس کی طرف سے منہ موڑ کر آتشدان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

شیلا نے کہا "نہیں نعیم، نہیں، تم اور میں اس گتھی کو نہیں سلجھا سکتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مسرت کے بھی درجے ہوتے ہیں، جب ہم اپنی ذاتی، محدود خوشی کے تمام امکانات

کھو بیٹھیں اور ہمارے دل یوں ویران ہو جائیں کہ ان میں سوا یادوں کے بھوت کے اور
کچھ باقی نہ رہ جائے، تو پھر ہمارے لئے ان کھنڈروں کو چھوڑ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔
زندگی تو رواں ہے۔ زندگی تو ہر وقت نئی نئی صورتوں میں ہمارے سامنے آتی ہے۔
اور اب تو یہی تقاضہ ہے کہ ہم زیادہ اونچی سطح پہ چلے جائیں اور وہاں سے زیادہ خوشیاں
زیادہ وسیع مسرتوں کی جستجو کریں جو صرف ہماری ذات تک محدود نہ ہوں، بلکہ جن میں
تمام انسانیت شریک ہو....."

لیکن شیلا محسوس کر رہی تھی کہ آج وہ کھنڈر ویران نہیں بلکہ آباد ہیں وہ
جانتی تھی کہ یہ ایک کہانی ہے جو ختم ہو جائیگی وہ سمجھ رہی تھی کہ اصلیت کی دنیا دوسری دنیا ہے
لیکن اس وقت نعیم، یہ کمرہ اس کی موجودہ زندگی اسے سطحی اور نقلی معلوم ہو رہی تھی۔
...... وہ یہی سوچ رہی تھی کہ بس وہی بات اصلی تھی۔ "ہم دونوں کھڑکی کے نزدیک جا کر
کھڑے ہو گئے۔ ہیرن اور میں" اس نے کمرے کی روشنی بجھا دی، باہر کا منظر اور کمرے کی
تاریکی اور ہیرن کا میرے بالکل قریب ہونا، معلوم ہوتا تھا جیسے مجھ پر نشہ چڑھ گیا ہو۔ ہیرن
نے آہستہ سے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں ڈری لیکن مجھ
سے ایک حرف نہیں بولا گیا۔ ہیرن بھی بالکل خاموش رہا میں اس سے کمزوری کے ساتھ
ہاتھا پائی کرتی رہی۔ لیکن وہ وحشیانہ بے خودی کے ساتھ مجھے پیار کرتا رہا۔ بس وہ ایک
فقرہ آہستہ سے تھوڑی دیر کے بعد کہتا تھا "میری پیاری!" "میری جان!" ان
دو ہی لفظوں میں اس وقت کتنے معنی تھے۔ آخرکار ایک مرتبہ میں نے زور لگا کر اپنے کو
اس کے پہلو سے چھڑا لیا۔ وہ میری طرف لپکا، لیکن میں دروازہ کھول کمرے کے باہر بھاگ
گئی۔ اور سیدھے اپنے کمرے میں جا کر دم لیا اور وہاں پہنچ کر میں نے رونا شروع کیا باوجود
کوشش کے میرے آنسو نہ تھمتے تھے، میرے دل، دماغ، جسم سب میں عجیب طرح کی سنسناہٹ
ہو رہی تھی۔ میں سو گئی۔ اس کے پہلے شاید ہی مجھے کبھی اتنی گہری نیند آئی ہو۔

"اس کے بعد ہم جیسے ایک جان اور دو قالب ہو گئے۔"

"یہ اُس رنگین کوہستانی علاقہ کی خوبصورتی تھی یا موسم کی لطافت تھی یا ہم دونوں میں چھپے ہوئے کسی ابدی مسرت کے چشمے تھے جو اُبل پڑے تھے، میں اپنے کو چاروں طرف سے ایک عجیب طلسماتی فضا میں گھِرا ہوا محسوس کرتی تھی۔"

شیلا پھر بولنے لگی "تم نے کبھی پہاڑوں کی سیر کی ہے؟ پیدل! میلوں چڑھائی پر چل کے، صنوبروں، آبشاروں اور گہری وادیوں کے بیچ میں؟" وہ ذرا دیر کے لئے رک گئی۔ نعیم اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔ لیکن کچھ بولا نہیں معلوم ہوتا تھا شیلا خود سے باتیں کر رہی ہے۔ "جھیل کے پاس سے ایک پتلی سی سڑک، کوئی دو گز چوڑی یا اس سے بھی کم، پہاڑ کے اوپر جاتی تھی۔ صنوبر کے بڑے بڑے درخت اس کے دونوں طرف سایہ کئے ہوئے تھے۔ دھوپ، درختوں کی پتیوں سے چھن چھن کر سڑک پر اور کنارے کے پہاڑ پر آ رہی تھی یہ سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ اس پر آدھ گھنٹے کے چلنے بعد آدمی اس موسم میں پسینے پسینے ہو جاتا تھا لیکن وہ اتنی بلندی پر پہونچ جاتا تھا کہ وہاں سے جھیل کے کنارے ٹہلنے والے لوگ بالکل چھوٹے چھوٹے اور مکانات گھروندے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور صنوبر کی باریک، نوکیلی، پتیوں سے سرسراہٹ کی نرم اور گہری آواز آ رہی تھی ایسی آواز جس کے اثر سے پہاڑوں کی عظمت، تنہائی دنیا کی جدوجہد اور کشمکش سے دوری کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

"یہ سڑک پہاڑ کے دامن میں ایک پتلی ڈور کی طرح لپٹی ہوئی تھی، اس کے ایک طرف گہرا کھڈ تھا اور دوسری طرف پہاڑ۔ جیسے پتھر کی ایک عظیم الشان دیوار جس کو دیوؤں نے اس ارادہ سے بنانا شروع کیا ہو کہ آسمان تک پہونچا دیں گے لیکن اس دیوار میں جگہ جگہ پر گہرائیاں، شگاف، اور غار تھے، پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے ان گہرائیوں اور چھوٹے مسطح حصّوں پر پڑے ہوئے تھے ان پتھروں پر سرخی مائل کائی سی ہوتی یا کبھی

کبھی وہ بالکل سپاٹ ہوتے بالکل جیسے کسی آدمی کی چمکتی ہوئی گنجی کھوپڑی، ان کے ادھر ادھر کبھی ان کے اندر سے، دو ٹکڑوں کے درمیان، بڑے درختوں کی جڑوں کے پاس چھوٹے چھوٹے پھول، نیلے، سفید، گلابی رنگ کے یوں نکلے ہوئے تھے، جیسے بڑے بڈھوں کے مجمع میں کمسن بچوں کا گروہ کہیں سے آجائے، اور ان کے گال شرم کی وجہ سے لال ہو جائیں اور ان کی آنکھیں زمین پر گڑ جائیں۔

"مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت کوئی تین بج رہے ہوں گے، میں ہیرن کے ساتھ اسی سڑک پر اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ ہم دونوں ذرا جھک جھک کر لمبے لمبے قدم آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے، ہر قدم کے ساتھ ہم گہری سانس لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم دیر سے چل رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں چھڑیاں تھیں اور پاؤں میں بڑے بوٹ اور ہم بالکل خاموشی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد ہم سڑک کے ایک کھلے ہوئے حصہ پر پہنچ گئے جہاں، کھڈ کی طرف بڑے درخت نہیں تھے اور نیچے کی وادی کا منظر دور تک دکھائی دیتا تھا، یہاں دھوپ پوری پڑ رہی تھی، ہم دونوں رک گئے اور سڑک کے کھلے ہوئے حصہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ ہماری نظروں کے سامنے عجیب منظر تھا۔

"سرسبز پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک وادی سیکڑوں گز نیچے نظر آتی تھی جس کے بیچ و بیچ میں وہی جھیل تھی جہاں سے ہم چلے تھے۔ سورج کی کرنیں اب صرف جھیل کے ایک حصہ پر پڑ رہی تھیں جو پارہ کی طرح نیلاہٹ لئے ہوئے چمک رہا تھا، دوسرا حصہ جس پر سایہ تھا گہرے، سیاہی مائل نیلے رنگ کا تھا۔ جھیل کے ایک کونے پر جدھر دھوپ تھی نہانے والوں کا ہجوم نظر آتا تھا جو اتنی دور سے چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس جگہ بڑی بڑی رنگ برنگ کی چھتریاں زمین سے گڑی ہوئی لگی تھیں، ان کے نیچے لوگ لیٹے ہوئے دھوپ کھا رہے تھے۔ چند ہوٹل بھی یہاں سے نظر آتے تھے ان کے کمرے یہاں سے بالکل

کبوتروں کی کابک معلوم ہوتے تھے، وادی کے دوسری طرف کا پہاڑ عجیب و غریب تھا۔ اس کے نیچے کا آدھا حصہ درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اوپر پہنچ کر یہ درخت کم ہوتے جاتے تھے ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اُگی ہوئی تھیں۔ اور بالکل چوٹی کے قریب پہونچ کر صرف بھوری چٹانیں رہ جاتی تھیں جن کی اونچی نیچی لکنگھی کی سی لکیر سے سوئی کی طرح نوکیلی چوٹیاں نکلی ہوئی تھیں۔ اس پہاڑ کے پیچھے جہاں تک نظر کام کرتی تھی کوہستانی علاقہ تھا، قطار اندر قطار دور تک سربفلک چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ افق کی حد پر پہونچ کر ہلکے سے نیلے فضا میں چھپا ہوا برفستان کا سلسلہ نظر آتا تھا۔ جہاں دھوپ کی چمک اور سایہ برف کی سفیدی اور آسمان کی نیلاہٹ سب ایک دوسرے میں مل جل کر آنکھوں کے سامنے رنگ، روشنی اور تاریکی عظمت و بلندی کی ایک ایسی مکمل تصویر کھینچ رہے تھے جس کا بیان کرنا ممکن نہیں۔

"ہم دونوں چپ بغیر کچھ بولے، ایک یا دو منٹ تک اس منظر کو دیکھتے رہے، ہم پر ایک عجیب قسم کی خاموشی چھا گئی! ان درختوں، پتھروں، پہاڑوں کے درمیان، اس آسمان اور ان بادلوں کے نیچے، اس گہری تنہائی میں ہم پوری طرح جذب ہو گئے تھے۔

"جلدی کرنا چاہیئے۔" ہیرن نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "ورنہ دیر ہو جائیگی" اور یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

میں بھی مڑی "ہاں جلدی کرنا چاہیئے۔" میں نے آہستہ سے دہرایا اور آگے بڑھی۔ اس کی آنکھیں، مجھے اس ہندستانی کی آنکھیں سب سے زیادہ اچھی معلوم ہوتی تھیں، ان کی سیاہی، ان کی چمکدار سیاہی اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی نرمی ..... رحم میں سوچتی تھی کہیں یہ کمزوری تو نہیں؟ لیکن جب وہ ہندستان کی باتیں مجھ سے کرتا تھا اور اپنے کاموں کی جو وہ ہندوستان میں کرے گا تو ان آنکھوں کی تری غائب ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں سے کبھی تو غم جھلکتا تھا اور کبھی آگ کے شعلے نکلنے لگتے۔

"ہم لمبے لمبے قدم لیتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتے جا رہے تھے، پتھر کی سڑک پر ہماری بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یکبارگی میرا دل بیٹھنے لگا۔ ہمارے اس عشق کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سوال میرے ذہن میں چکر لگانے لگا۔ جیسے بچے اندھیرے میں بہت سے ڈرتے ہیں۔ مجھے ڈر معلوم ہونے لگا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نہ خوشی کا چراغ جیسے یکایک بجھ جاتے۔

"ہیرن کیا تم دراصل مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

ہیرن یکبارگی رک کر ہنسنے لگا۔ اور سوال کا جواب دیئے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس نے کہا:۔

"ہرگز نہیں! میں بھلا کس طرح تم سے محبت کر سکتا ہوں؟ ہم میں کونسی بات یکساں ہے؟ میں کالا، تم گوری! میں ہندستانی، تم انگریز! میں بت پرست، تم عیسائی! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے دل میں تم سے صرف نہیں بلکہ تمہاری ساری قوم سے نفرت بھری ہوئی ہے۔ نفرت اگرم نفرت کھولتی ہوئی نفرت! پھر میری جان، تم خود انصاف کرو کیسے میں تم سے محبت کر دوں؟"

"ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور بات جیسے ختم ہو گئی، ہم چلتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد ہیرن بولا "لیکن پہ سچ، مجھے یہ وہم و گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ میں یورپ میں اس بری طرح سے عشق کے جال میں پھنسوں گا۔ اور اب تو تم ہی تم مجھے چاروں طرف نظر آتی ہو!"

یہ سن کر مجھے بیحد خوشی ہوئی لیکن میں نے کہا "نا! یہ غلط ہے۔ مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آتا۔ تم نے اپنی زندگی کا ایک مقصد چن لیا ہے۔ یہ مقصد تمہیں مجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

"کیا اس مسئلہ پر کبھی ہماری ایک رائے نہ ہوگی؟" ہیرن نے غمگین لہجہ میں کہا "تم بار بار مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہو کہ انسانی زندگی کا دائرہ صرف عشق اور محبت تک محدود نہیں؟ کیا اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل اور بہت سی دلچسپ اور غیر دلچسپ چیزیں نہیں ہیں جن سے ہم وابستہ ہیں؟ ان چیزوں کو چھوڑ کر ہم ایک خلائے محض میں رہ کر عشق

نہیں کر سکتے جس طرح زندگی کے لئے ہوا ضروری ہے۔ میرے خیال میں اسی طرح تمہاری اور میری محبت کا انحصار کم از کم میرے لئے ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش پر ہے جنھیں تم کبھی ہو کہ میں تم سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں میری جان! تم میں اور ان مقاصد میں کسی قسم کا کوئی تضاد اور جھگڑا نہیں، تمہاری محبت مجھے اور زیادہ دلیر بنا رہی ہے۔ زندگی اب بھی مجھ کو مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن تمہاری ساتھ ہونے سے یہ دشوار راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔ میں تم سے صرف ایک وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ جہاں تک میرا بس ہے میں کبھی اس راستے پر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا...... لیکن تم! کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ تم میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو؟"

"اس کا ایک ایک لفظ مجھے نہیں بھولتا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بیخود ہو کر جواب دیا" تمہارے ساتھ میں ہر جگہ، ہر طرف جانے کے لئے تیار ہوں جو کوئی بھی راستہ ہو جیسی بھی راہ ہو اگر تم میرے ساتھ ہو، میں بے دھڑک آگے بڑھتی چلی جاؤں گی۔ جیسے اس وقت! مگر میرے دل میں محبت کی مسرت ایک عجیب قسم کے رنج سے ملی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی

ہم دونوں پر پھر خاموشی چھا گئی۔ سورج کے سامنے بادل کا ایک ٹکڑا آ گیا اور دھوپ چھپ گئی، ان کے دونوں طرف، بلند صنوبر کے درختوں کا گھنا جنگل تھا۔ ساری سڑک پر بھورے رنگ کی نوکیلی، خشک پتیاں، تہ بہ تہ لدی ہوئی تھیں جن پر چلنے سے پیر پھسلتا تھا ان میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ بادل آجانے سے وہاں اندھیرا بھی تھا۔

"ہم ایک موڑ کے قریب پہنچے تھے کہ ایک بڈھا سوئس گائڈ ہماری طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ سبز رنگ کی چھوٹی سی ٹوپی پہنے تھا اس کے چہرے کا رنگ اس قسم کے گہرے سیاہی مائل سرخ رنگ کا تھا جو کھلی ہوا، طوفان اور دھوپ میں زندگی بسر کرنیوالوں کا ہوتا ہے؛ اس کے گالوں اور ماتھے پر لکیریں گہری گہری سیاہ کھائیوں کی طرح تھیں لیکن

باوجود اس کے وہ بڈھا طاقتور معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پیٹھ پر پہاڑ پر چڑھنے والی رسّی اور ایک گٹھڑی لدی ہوئی تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں کوئی سوا گز لمبا ایک ڈنڈا تھا جس کے دونوں کناروں پر لوہے کی موٹی کیلیں لگی ہوئی تھیں، نیچے کی طرف سیدھی اور اوپر آڑی
قریب پہنچ کر بڈھے نے ہماری طرف مسکرا کر دیکھا اور سلام کیا۔

گڈ مارگ" اس نے کہا سوئس جرمن لہجہ میں۔

"گڈ ڈے" ہم نے ایک ساتھ جواب دیا۔ پھر بڈھا گائڈ ذرا دیر کے لئے رک گیا اور اس نے کہا "آپ لوگ زائلر جارہے ہیں؟ جلدی کیجئے ورنہ طوفان میں پھنس جایئے گا۔ آسمان کا رنگ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

ہم بھی رک گئے۔ ہیرن نے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں گائڈ سے پوچھا "یہاں سے زائلر پہونچنے میں ہمیں کتنی دیر لگے گی؟"

"کوئی دو گھنٹے۔ اگر آپ لوگ تیزی سے جائیں۔ راستے بھر بالکل پناہ کی کوئی جگہ نہیں۔ اگر بارش ہونے لگی تو اس سے بچاؤ ممکن نہیں۔"

"ہم اور تیز چلنے کی کوشش کریں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ نے ہمیں ان باتوں سے آگاہ کردیا۔" میں نے کہا۔ ہم نے گائڈ کو خدا حافظ کہا اور پھر چڑھائی پر تیزی کے ساتھ قدم بڑھانا شروع کئے۔

"کاش کہ میں سوئزرلینڈ میں گائڈ ہوتا!" ہیرن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کیوں؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"قدرت کی اندھی طاقتوں کے اس قدر قریب ہونا! طوفان، بارش، برف، تیز ہوائیں، سردی ان سب کا مزاج سمجھنا اور ان سے لڑنا، ان پر قابو پانا!! انسانی زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا مدّعا ہوسکتا ہے؟"

"لیکن ان طاقتوں کو قبضہ میں لانے کی یہی تو ایک صورت نہیں کہ آدمی پہاڑوں

میں ساری زندگی بسر کرے!"

"ہرگز نہیں۔ سائنس داں اپنی کوٹھریوں میں بیٹھ کر بھی یہ کام کر سکتے ہیں لیکن میری طبیعت اس طرف مائل نہیں ہیں تو چاہتا ہوں کہ طوفانی ہواؤں کے تھپیڑے کھاؤں اور پہاڑوں کی وادیوں میں دوڑتی ہوئی ہواؤں کی چیخ سنوں۔ لمبے لمبے درختوں کا بدمست شرابیوں کی طرح جھومنا اور پتوں کا بے بسی سے تالیاں بجانا، مجھے یہ سب بھی پسند ہیں...... لیکن تم! تم مجھے ان سب سے زیادہ پسند ہو!"

میں نے ہنس کر کہا "تو پھر آپ گائڈ کیوں نہیں بن جاتے۔ یہ تو کوئی بڑی مشکل بات نہیں!"

"شاید اسی وجہ سے کہ یہ مشکل نہیں! میرے گائڈ بننے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ ابھی تک تو انسان خود اپنے روزمرہ کے کاروبار میں اندھی طاقتوں کا شکار بنا ہوا ہے۔ ابھی تو ہمیں ان انسانی طاقتوں سے لڑائی لڑنا ہے۔ اس کے جیتنے کے بعد ہم کو یہ فرصت پوری طرح ملے گی کہ ہم قدرت کی اندھی طاقتوں سے اپنی اپنی صلاحیت اور پسند کے مطابق دست گریبان ہوں۔"

"میں اسے چھیڑتی جاتی۔" میں نے کہا۔

"آپ تو یوں باتیں کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ساری مشکلوں اور تکلیفوں کا بار آپ ہی کے کندھوں پر لدا ہوا ہے!"

اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"نہیں۔ مگر میرے کاندھے پر ان مصائب کا ایک حصہ تو ضرور ہے۔ میں تو صرف اسی کو ہلکا کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم سب کو اس کا احساس ہو جائے تو آدھی سے زیادہ لڑائی یونہیں فتح ہو جائے گی لیکن اس وقت اسے بھلا دو۔ اس وقت اسے بھلا دو۔ اس وقت بس میں تم کو اور صرف تم کو یاد رکھنا چاہتا ہوں!"

"ہم یونہیں باتیں کرتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جوں جوں ہم آگے

بڑھتے تھے سڑک پتلی ہوتی جاتی تھی۔ کہیں کہیں تو دو آدمی بمشکل ایک ساتھ گذر سکتے تھے چڑھائی سخت تھی، راستہ پر پتھر کے ٹکڑے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، بعض جگہ بڑی بڑی چٹانیں اوپر سے یوں نکلی ہوئی تھیں کہ راستہ پر آدھی چھت سی بن گئی تھی۔ باوجود کوشش کے ہمارے قدم چڑھائی اور اونچائی کی وجہ سے اب آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔

"اور میرا دل بھاری تھا، ایک بوجھ سا جو معلوم ہوتا تھا اس طرح عشق سے ملا ہوا ہے جیسے ہوا میں بادل۔ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔

"وہ دن آج کتنا دور معلوم ہوتا ہے!

"سب کچھ تھا لیکن میں رہ رہ کر محسوس کرتی تھی کہ میری خوشی پہلے کی سی نہیں تھی۔ میرے دل میں بار بار سوال اٹھتا تھا کیا اس میں کمی ہونا شروع ہو گئی؟ اور میں خود ہی جواب دے لیتی۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ پھر آخر کیا بات تھی؟

"میں بار بار سوچتی تھی کہ آخر اس بے انتہا محبت کا انجام کیا ہوگا؟ ہیرن مجھے اپنے ساتھ ہندوستان لے جانا چاہتا ہے اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا تب؟

"ہیرن غریب ہے اسے روپیہ کمانے ہوں گے بغیر اس کے ہم کیسے ہندوستان میں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اور میں بھی غریب ہوں، میں اپنے دل میں کہتی کاش کہ میرے پاس بہت سی دولت ہوتی! پھر خیال آتا تھا کہ مجھے اپنے بے بہا عشق پر اعتماد نہیں۔ مجھے ہیرن پر بھروسہ نہیں۔ یا خدا! میں کس قدر شکی طبیعت کی ہوں! وہ جس کے لئے میں اپنی جان، سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں، کیسے میرے دل میں اس کی طرف سے شبہ پیدا ہوا۔

"مجھے اس لڑکے سے محبت ہے! مجھے اس لڑکے سے بہت محبت ہے، اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتی تھی، میرا دماغ اس وقت بالکل نہیں کام کرتا۔ نیلم کبھی تم کو کبھی پہاڑوں کی عظیم الشان خاموشی کا احساس ہوا ہے؟ اس میں عجیب دلکش ہیبت ہوتی ہے اس وقت وہاں کتنی خاموشی، سناٹا۔ صرف ہمارے چلنے کی آواز، کھٹ پٹ اور پتھر

کے مدڈول پر ہوا بھی بند ہوگئی اور بادل گھرتے چلے آتے ..... "

میں نے ہیرن کی طرف دیکھ کر کہا " ہیرن ! "

" کیا ہے شیلا ؟ "

" مجھ سے باتیں کرو۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتی ہوں ؟

اس نے میری طرف محبت بھری ایک نظر ڈالی اور میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا

" جس چیز کے بارے میں تم حکم دو میں تم سے اسی کی باتیں کروں "

" جو تمہارا جی چاہے۔ اچھا ہندستان اپنے ملک کی باتیں کرو " میں نے اس سے کہا۔
ہیرن مجھ سے اکثر ہندستان کی سوشل اور سیاسی باتوں کے بارے میں گفتگو کرچکا تھا وہ کہنے لگا۔

" میں تم سے اس ملک کے بارے میں کیا کہوں ؟ ہمارے یہاں دنیا کی ہر اچھائی اور دنیا کی ہر برائی انتہا تک پہونچ گئی ہے۔ نہیں میں نے غلط کہا۔ مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ ہندستان میں دنیا کی تمام خوبیاں اپنی حد تک پہونچائی جاسکتی ہیں، لیکن برائیاں اپنی حد تک ابھی سے پہنچ گئیں۔

" تم نے بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ ہندستان میں " روحانیت " کا بہت زور ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ روحانیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو " مادیت " کے خلاف یعنی مادی چیزوں کی پروا نہ کرنا، دین داری، خدا پرستی، آخرت کی باتوں کو دنیادی چیزوں پر ترجیح دینا "

" اور دوسرے معنی روحانیت کے کیا ہیں ؟ " میں نے پوچھا۔

" دوسرے معنی روحانیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ اسی دنیاوی زندگی میں لالچ، ہوس، دوسروں پر جبر و ظلم کرنے کی طاقت، جہالت، بدعقلی، بدمذاقی کو کم کرنا اور زندگی کے ان سوئے ہوئے نغموں کو جگانا، جن کے سننے کے لئے ہمیں ایک بڑا دل، ایک بیدار دماغ اور ایک تندرست جسم چاہیئے۔

"روحانیت" کی دونوں قسمیں ہمارے یہاں بالکل مفقود ہیں۔"

میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا "آپ تو بڑے مادیت پرست بنتے تھے آج روحانیت کا کیوں آپ پر دورہ ہے؟"

"میں تو مادیت پرست ہوں لیکن وہ اسی لئے کہ انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی کو ممکن کرنے میں مدد دوں، آج جو لوگ روحانیت کا نام لیتے ہیں اُن کو اس چیز سے کہیں دور کا بھی تعلق نہیں روحانیت ہو کیا؟ تہذیب میں ڈوبا ہوا دماغ! ہیرن کہنے لگا تم اخبار دل میں پڑھتی ہوگی کہ ہمارے یہاں ہندو اور مسلمان اور سکھ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں مذہبی سوالات کی بناء پر لیکن اس کے کیا یہ معنی ہیں کہ ان میں روحانیت یا مذہبیت بھری پڑی ہے؟ بالکل نہیں۔ چند مذہبی لیڈر جو بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتے اگورنمنٹ میں رتبہ حاصل کرنے کے لئے جس میں صرف ان کا ذاتی فائدہ ہے، ذرا ذرا سی باتوں پر بے قصور غریب لوگوں کو مذہب کا نام لے کر آپس میں لڑا دیتے ہیں۔ مذہب اور روحانیت سے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

"رہ گئی دوسری قسم کی روحانیت، جو قوم غلام ہو جس میں اسّی فی صدی انسانوں کو پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو، جس میں مرض، وبا، بیماری اس قدر پھیلی ہو کہ سارے ملک میں مشکل سے تندرست انسان نظر آتے ہوں، جہاں علم گنتی کے لوگوں تک محدود ہو، جہاں بچے تک کمہلائے ہوئے پھولوں کی طرح ہوں، جہاں اکثر لوگوں کے چہروں پر بھوک، فاقہ، غربت، مصیبت لکھی ہوئی ہو اور باقیوں کے چہرہ سے سستی، حماقت، جہالت، اور ایک مکروہ قسم کی خوشحالی، نظر آتی ہو وہاں زندگی کے ان رنگین تحفوں کو تلاش کرنا سراسر حماقت ہے۔"

"تم مبالغہ کر رہے، یقیناً اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں، جنھیں ان باتوں کا احساس ہے اور جو تبدیلیاں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

ہیرن ہنسا، اس نے کہا "ہاں شاید تمہیں اس لئے یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ تم سمجھ

ان میں سے کسی درجہ میں نہیں رکھ سکتیں۔ ایک تیسری قسم ہمارے یہاں اور ہے، باتیں کرنے والوں کی۔ یہ لوگ سمجھ دار ہیں، دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کی تہ تک وہ نہ پہنچ سکیں۔ ان میں اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کا مادہ ہے، یہ ہر چیز کی اصلیت ہر بات کی وجہ سمجھتے ہیں لیکن بس یہاں تک پہنچ کر وہ آگے بڑھنے سے معذور ہیں۔ ان میں زندگی کو سمجھنے کا مادہ ہے لیکن اس کو تبدیل کرنے کا مادہ نہیں، انھوں نے اپنے کو ہندستان کے کروڑوں محنت کشوں کی حیات بخشنے والی انقلابی جدوجہد سے پیوست نہیں کیا ہے، ان لوگوں کی حالت سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ بزدلی، آرام پسندی، سستی، ذہنی انتشار کے شکار ہو کر آخر کار یہ لوگ بھی، اپاہجوں اور ناکاروں کے گروہ میں مل جاتے ہیں......"

تم پر آج ناامیدی غالب معلوم ہوتی ہے جبھی اس طرح سے باتیں کر رہے ہو" میں نے کہا یونہی باتیں کرتے کرتے ہم اپنی منزل مقصود ڈاکر تک پہنچ گئے۔ اس جگہ صرف ایک چھوٹا سا چھ سات کمروں کا ہوٹل تھا ایک بلند پہاڑ کے اوپر۔ اس ہوٹل کے سامنے کی طرف جدھر وہ راستہ تھا جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے، کوئی آٹھ دس گز لمبا اور تین چار گز چوڑا برآمدہ تھا جو تین طرف سے شیشوں سے بند تھا۔

"چھ بجنے کے قریب تھے، چاروں طرف کالے کالے بادل چھائے جا رہے تھے اور اندھیرا بڑھتا جاتا تھا، لیکن باوجود اس کے یہ مقام اتنا خوبصورت تھا کہ تین ساڑھے تین گھنٹے کی سخت چڑھائی کی مشقت یہاں پہنچ کر بھول جاتی تھی۔ ایک حوض کی طرح کی وادی جس کی تہ پر سبزہ زار، اس کے بیچ و بیچ میں ایک تیزی سے بہتا ہوا چھوٹا سا دریا، چاروں طرف کے پہاڑ اس بلندی سے زیادہ اونچے نہیں معلوم ہوتے تھے، ان کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی، ان کے دامنوں پر جس طرف کبھی نظر اٹھتی تھی ادھر ہی بزور دشور کے ساتھ بلندی سے گرتے ہوئے آبشار تھے جن کی آواز تمام وادی میں گونج رہی تھی، بیچ والا آبشار سب میں بڑا تھا۔ وہ کوئی تیس چالیس گز کی بلندی سے نیچے گرتا تھا، اس کے بعد اس کا پانی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا نیچے

آکر ایک پرجوش سا دریا بن جاتا تھا اور وہاں سے بہتا ہوا وادیوں میں غائب ہو جاتا تھا۔

" ہم اس وقت اکیلے ہی ہوٹل میں تھے ' ہم ایک میز کے پاس' جہاں سے باہر کا منظر اچھی طرح دکھائی دیتا تھا جا کر بیٹھ گئے۔

" اتنی دور پیدل چلنے کے بعد ہمیں بھوک معلوم ہو رہی تھی' ہوٹل کی خادمہ ایک موٹی سی نوجوان دیہاتی سوئس لڑکی ہمارے لئے چائے اور روٹی' مکھن' مربہ لے آئی اور ہم نے کھانا پینا شروع کیا۔

" اتنے میں بارش ہونے لگی اور باہر تاریکی بڑھ گئی۔

" آج ہم یہیں رُک جائیں تو بہتر ہے " ہیرن نے کہا " اس وقت بارش میں واپس جانا ناممکن ہے " لیکن آخر میں تم سے کیوں یہ سب بیان کر رہی ہوں ؟ مجھے یہ کیا ہو گیا ہے میری زبان رکتی ہی نہیں نعیم مجھے ایک سگریٹ دو "

نعیم نے بڑھ کر اسے سگریٹ دیا اور وہ اسے پینے لگی' اس کے چہرے کے ارد گرد نیلے دھوئیں کا نقاب چھا گیا۔ وہ پھر جیسے اپنے خیالات میں ڈوب گئی۔

نعیم نے کہا " شیلا ! کیا ہماری مجبوری کا کچھ علاج بھی ہے ؟ یہ بھی کتنا تکلیف دہ اتفاق ہے کہ ہم دونوں جذبات کے اس طوفانی سمندر میں بے بسی کے ستائے بادبان کشتیوں کی طرح تھپیڑے کھا رہے ہیں لیکن ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ بیچاری شیلا ! "

لیکن شیلا کرسی پر جیسے سو گئی تھی۔ اسے وہ زلزلہ والی طوفانی رات یاد آ رہی تھی۔ وہ محبت اور غم کی رات۔ جب سوتے سوتے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے دبی کمزور آواز میں " ہیرن میرے پیارے ہیرن کہہ کر اسے جگا دیا تھا۔

" کیوں ' کیا بات ہے ؟ اس نے چونک کر پوچھا۔

" مجھے اپنے سینے سے چمٹا لو ' ڈارلنگ ! مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے " اس نے کہا تھا۔

ہیرن نے اسے زور سے اپنے سینے سے لگا دیا تھا اور اس کے لبوں اور آنکھوں کا

بار بار بوسہ لیا۔

"میری پیاری، میری سب سے پیاری شیلا!"

پھر اس نے سر اٹھا کر شیلا کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ اس کے بال تکیہ پر اور اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے، ہیرن نے انھیں اٹھایا تھا اور اس کی نرم زلفوں میں اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگا تھا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کا صرف خاکہ دکھائی دیتا تھا اسکی آنکھوں اور بھووں کی سیاہی، اس کی ناک، اس کے دونوں لبوں کی ابھری ہوئی لکیر۔

"شیلا! ڈر کس بات کا؟" اس نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ یہاں اتنا سناٹا ہے اور ان آبشاروں کے بہنے کی مسلسل آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ ہیرن!... ہمارا... ہماری محبت کا انجام کیا ہوگا؟"

"ہماری محبت کا انجام؟" وہ ذرا دیر چپ رہا پھر اس نے کہا: "سنو شیلا، میری جان! آج دن کو جب میں تم سے اپنے وطن کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے صرف وہاں کی تلخ حقیقتوں کا ذکر کیا تھا۔ تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ وہاں بہت سی اچھی چیزیں بھی ہیں، شام کے وقت جب برسات میں سورج ڈوبتا ہے اور آسمان پر آگ لگ جاتی ہے، اور جب چاندنی نکلتی ہے اور ہمارے ملک کے ہرے بھرے کھیتوں اور سرسبز میدانوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے دریا، پگھلے ہوئے چاندی کی ایک تھراتی ہوئی درخشاں لکیر بن جاتے ہیں اور اس ملک کے کروڑوں محنت کرنے والے انسان جو اپنی غریبی اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے ہیں، یہ سب بہت پیارا ہیں۔ اس تصویر میں جس کی خوبصورتی میں اتنا سوز و گداز بھرا ہوا ہے، میں بھی کسی طرح کھپ جانا چاہتا ہوں۔ اس بات کی خواہش، اس کی کوشش ہی میرے لئے حیات ہے، مجھے زندہ رہنا ہے ....

"ہمارے لئے زندگی کی اور کوئی دوسری صورت نہیں۔ دوسرے راستے ہمیں روحانی موت کے خشک ریگستان میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں، جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔